جواہر لال نہرو

باپ کے خط بیٹی کے نام

مرتبہ

عتیق صدیقی

نہرو انسٹیٹوٹ آف ڈیماکریٹیک سوشلزم
نئی دہلی

۲

سلسلۂ اشاعت نہرو انسٹیٹوٹ آف ڈماکریٹک سوشلزم

تاریخِ اجرا : ۲۶ر دسمبر ۱۹۶۹ء
ناشر: نہرو انسٹیٹوٹ اف ڈماکریٹک سوشلزم
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مطبوعہ: جیّد پریس، دہلی ۶

دِیباچہ

یہ خطوط میں نے اپنی بیٹی اندیرا کو ۱۹۲۸ء کی گرمیوں میں لکھے تھے۔ وہ اس وقت ہمالہ کے مسوری پہاڑ پر تھی اور میں نیچے میدانی علاقے میں۔ یہ بالکل نج کے خطوط تھے، جو ایک دس برس کی بچّی کو لکھے گئے تھے۔ لیکن میرے کچھ دوستوں کو، جن کے مشوروں کی میں قدر کرتا ہوں، ان خطوں میں کچھ خوبی نظر آئی اور انھوں نے یہ رائے دی کہ اور لوگوں کو بھی ان کے پڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔ معلوم نہیں دوسرے لڑکے لڑکیوں کو یہ پسند آئیں گے بھی یا نہیں، لیکن مجھے یہ اُمید ضرور ہے کہ جو بچّے بھی ان کو پڑھیں گے ان کے دلوں میں دھیرے دھیرے یہ خیال ضرور گھر کرے گا کہ ہماری یہ دُنیا قوموں کا ایک گھرانہ ہے۔ مجھے ان کے لکھنے میں بڑا لُطف آیا، اور میرا خیال ہے کہ پڑھنے والوں کو بھی ان کے پڑھنے میں، اتنا نہ سہی، تو کچھ نہ کچھ مزا ضرور آئے گا۔

ان خطوں کا سلسلہ ایکا ایکی بند ہوجاتا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ گرمیوں کا طویل موسم ختم ہوا تو اندیرا مسوری سے واپس آگئی۔ پھر ۱۹۲۹ء کی گرمیوں میں اُسے نہ تو مسوری جانا نصیب ہوا اور نہ کسی دوسرے

آدمی اگر قبیلے کے لیے کام نہ کرتا تو اسے قبیلے سے نکال دیا جاتا تھا۔

مل جل کر کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کام باقاعدگی سے کیا جائے۔ لوگوں نے اگر اپنی اپنی مرضی کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا، تو قبیلہ کہاں رہ گیا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ کسی ایک کو سردار بنا دیا جائے۔ جانوروں کے ریوڑ میں بھی ایک سردار ہوتا ہے۔ اسی طرح آدمیوں کے قبیلوں نے بھی، قبیلے کے سب سے زیادہ طاقت ور آدمی کو، سردار بنانا شروع کیا۔ سب سے زیادہ مضبوط آدمی کو اس لیے چُنا جاتا تھا کہ لڑنے بھڑنے کی بہت زیادہ ضرورت ہوا کرتی تھی۔

قبیلے کے لوگ اگر آپس ہی میں لڑنا جھگڑنا شروع کرتے، تو قبیلہ ہی ختم ہو جاتا۔ اس لیے سردار کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ قبیلے میں لڑائی جھگڑا نہ ہونے دے۔ ہاں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے لڑ سکتا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں، یہ ترقی کا ایک قدم تھا، کیوں کہ پہلے ہر آدمی اپنے ذاتی فایدے ہی کے لیے دوسروں سے لڑا کرتا تھا۔

ابتدائی دور میں قبیلہ ایک بڑا خاندان ہوتا رہا

ہوگا، اور قبیلے کا ہر فرد ایک دوسرے کا رشتہ دار ہی رہا ہوگا۔ لیکن خاندان بڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ بہت بڑے بڑے ہو گئے۔

شروع زمانے میں انسان کی زندگی بڑی کٹھن رہی ہوگی، خصوصاً قبیلوں کے بننے سے پہلے — نہ تو اس کے پاس گھر ہوتا تھا، اور نہ کپڑے۔ ہوسکتا ہے کہ کپڑے کی جگہ پر اس کے پاس جانوروں کی کھال رہتی رہی ہو۔ اور ہر وقت اسے لڑائی کرنی پڑتی رہی ہوگی۔ پیٹ پالنے کے لیے اسے روزانہ یا تو شکار کرنے اور جانوروں کو مارنے کی فکر ہوتی رہی ہوگی، یا پھل پھلاری جمع کرنے کی۔ اسے ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے رہے ہوں گے۔ قدرت کو بھی وہ اپنا دشمن ہی سمجھتا رہا ہوگا، جو کبھی اولے برساتی تھی، کبھی برف باری کرتی تھی اور کبھی زلزلہ لاتی تھی۔ غریب انسان کی حالت غلام کی سی رہی ہوگی، جو ڈرا سہما زمین پر رینگتا پھرتا رہا تھا۔ کیوں کہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اولے برستے تو وہ سمجھتا کہ بادلوں میں چھپا ہوا کوئی دیوتا اسے پتھروں سے مار رہا ہے۔ اور وہ سہم کر بادلوں میں چھپے ہوئے دیوتا کو خوش کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتا، جو اولے

گراتا تھا، پانی برساتا تھا اور برف گراتا تھا۔ دیوتا کو خوش کیسے کیا جائے؟ نہ تو اس کی سمجھ میں کچھ آتا تھا، اور نہ اسے عقل ہی تھی۔ وہ سوچتا رہا ہوگا کہ بادلوں میں چھپا ہوا دیوتا اُسی جیسا ہوگا، اس لیے کھانے کی ضرورت اسے بھی ہوتی ہوگی۔ چناں چہ وہ یا تو گوشت کی بھینٹ چڑھاتا، یا کسی جانور کو مار کر، دیوتا کے کھانے کے لیے، کسی جگہ چھوڑ دیتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سے بارش رک جائے گی یا اُولے گرنا بند ہو جائے گا۔

یہ باتیں آج ہمیں احمقانہ معلوم ہوتی ہیں، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ بارش، برف باری اور اولہ باری کے کیا اسباب ہیں۔ جانوروں کی بھینٹ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ اگرچہ احمقانہ سی بات ہے۔ لیکن آج بھی بہت سے لوگ اپنی ناسمجھی میں یہی باتیں کرتے ہیں۔

*

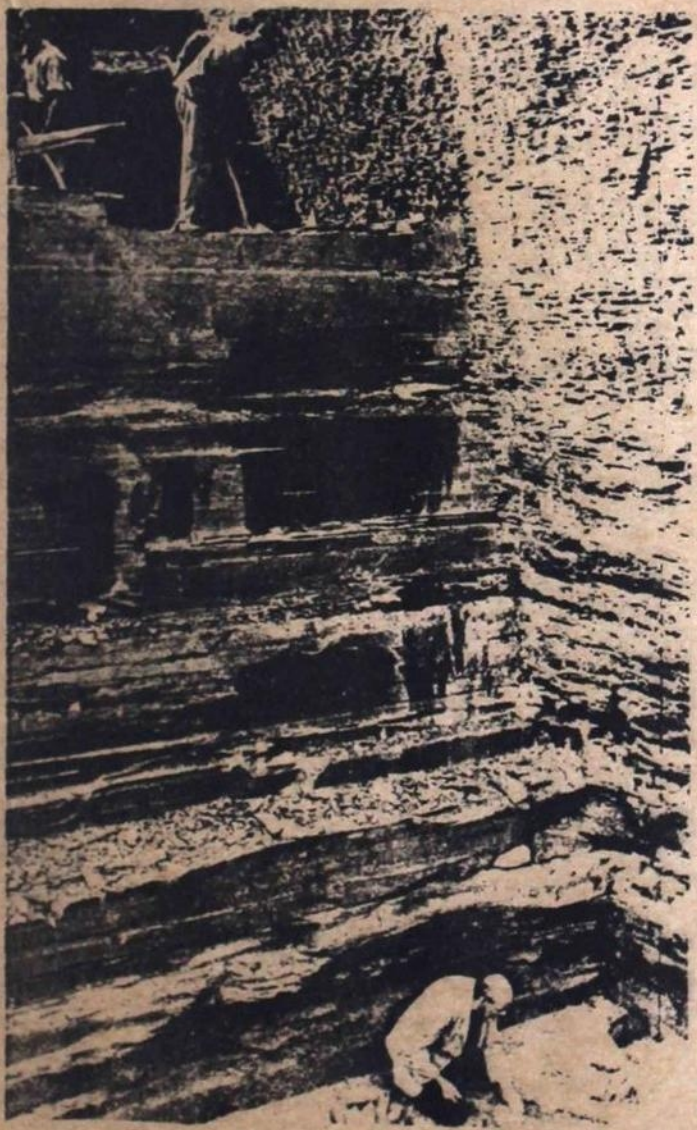

قدیم انسانی تہذیب کی جستجو

مذہب کی ابتدا، اور کام کی تقسیم

میں نے پچھلے خط میں تمھیں بتایا ہے کہ شروع زمانے کا آدمی ہر چیز سے ڈرتا تھا، اور وہ سمجھتا تھا کہ جتنی آفتیں آتی ہیں، دیوتاؤں کے غیض وغضب اور اُن کے بغض کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ خیالی دیوتا اُسے ہر جگہ نظر آتے — جنگلوں میں، پہاڑوں میں، دریاؤں میں، بادلوں میں۔ دیوتا، اس کے تصوّر کے مطابق، نیک اور رحم دل نہیں، بلکہ بڑے ہی غضب ناک ہوتے تھے، جن کے مزاج کا پارہ ہر وقت چڑھا رہتا تھا۔ چوں کہ اُن کے غضب سے وہ سہمے رہتے تھے، اس لیے اُنھیں کچھ رشوت دے کر، خصوصاً کھانا دے کر، خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ اگر کبھی زلزلہ آتا، یا طغیانی یا کوئی وبا آتی، جس سے بہت سے آدمی مرجاتے، تو وہ بے حد سہم اُٹھتے اور سمجھتے کہ دیوتا ناراض ہوگئے ہیں، اور انھیں راضی کرنے کے لیے وہ آدمیوں کی بھی بھینٹ چڑھاتے،

بلکہ خود اپنے بچوں تک کو مار کر دیوتاؤں کی نذر کر دیتے۔ یہ بڑی ہی بھیانک بات ہے، مگر آدمی جب خوف زدہ ہوتا ہے، تو وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔

مذہب کی یقیناً یہیں سے شروعات ہوئی ہوگی۔ اس طرح مذہب خوف سے پیدا ہوا، اور جو بات بھی ڈر کر کی جائے، بُری ہوتی ہے۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ مذہب ہمیں بہت سی اچھی اچھی باتیں بھی سکھاتا ہے۔ جب تم بڑی ہوگی تو دنیا کے سب مذہبوں کے بارے میں پڑھوگی، اور وہ تمام اچھی اور بری باتیں تمھیں معلوم ہوں گی جو مذہب کے نام پر کی گئی ہیں۔ اس جگہ صرف یہ جاننا دل چسپ ہوگا کہ مذہب کا تصوّر پیدا کیسے ہوا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے مذہب کے تصور نے ترقی کیسے کی۔ لیکن ترقی اس نے جتنی بھی کی ہو، ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ مذہب ہی کے نام پر لوگ لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کے لیے تو یہ صرف ایک ڈر کی چیز ہے۔ ایک خیالی وجود کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ اپنا وقت صرف کرتے ہیں، مندروں میں چڑھاوے چڑھاتے ہیں، بلکہ جانوروں کی قربانی بھی کرتے ہیں۔

ہاں تو ابتدائی زمانے کے آدمی کی زندگی بڑی ہی کٹھن رہی ہوگی۔ ہر روز اسے اپنے کھانے کے سامان کی فکر کرنی ہوتی تھی، ورنہ اسے فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ کوئی کاہل آدمی اس زمانے میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ کوئی آدمی کچھ دنوں کا کھانا ایک مرتبہ اکٹھا کرلیتا اور پھر چند روز مزے سے آرام کرتا۔

قبیلے جب بن گئے تو آدمی کی زندگی کچھ آسان ہوگئی۔ قبیلے کے سب لوگ مل جل کر کام کرنے لگے، تو ان میں سے ہر ایک کو اس سے کہیں زیادہ غذا ملنے لگی، جتنی پہلے ایک آدمی خود اپنے لیے حاصل کرلیتا تھا۔ تمھیں معلوم ہے کہ مل جل کر ہم اگر کام کریں تو اس سے کہیں زیادہ کام ہوسکتا ہے، جتنا کہ ہم تنہا کرسکتے ہیں۔ کسی بھاری بوجھ کو ایک یا دو آدمی اٹھا کر شاید نہ لے جاسکیں، لیکن کئی آدمی اگر ایک دوسرے کی مدد کریں تو وہی بوجھ آسانی سے اٹھایا اور لے جایا جاسکتا ہے۔ آدمی نے اسی زمانے میں ترقی کا ایک اور قدم بڑھایا، جس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں۔ اس نے کھیتی باڑی شروع کی۔ یہ بات تمھیں دل چسپ معلوم ہوگی کہ کھیتی کرنے کا تصور چیونٹیوں کی زندگی میں بھی ملتا ہے۔ میرا یہ

مطلب نہیں ہے کہ چیونٹیاں جوتتی، بوتی اور فصل کاٹتی ہیں۔ بلکہ چیونٹی یہ کرتی ہے کہ کوئی ایسی جھاڑی اگر اسے مل جائے، جس کے بیج وہ کھا سکتی ہو، تو بڑی احتیاط سے وہ اُس گھاس کو چن کر الگ کرتی ہے، جو بیج کے ارد گرد ہوتی ہے۔ بیج کو تو وہ کھا لیتی ہے، اور اصل جھاڑی کو چھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح سے جھاڑی زیادہ دنوں تک پھلتی پھولتی رہتی ہے۔

آدمی نے بھی، ایک زمانے میں، شاید یہی کیا ہوگا، جو چیونٹیاں کرتی ہیں۔ اُس وقت کے آدمی کھیتی باڑی کے کام کو سمجھتے نہیں تھے، اور اسے سمجھنے میں اور بوائی شروع کرنے میں انھیں بہت وقت لگا ہوگا۔

کھیتی کا گُر سیکھ لینے کے بعد غذا کا ملنا آسان ہوگیا ہوگا۔ اور پھر آدمی کو اپنے کھانے کے لیے ہر روز شکار کرنے کی فکر باقی نہ رہی ہوگی۔ اس طرح ان کی زندگی اتنی کٹھن نہ رہ گئی ہوگی، جتنی کہ پہلے تھی۔ اب ایک اور مزے دار تبدیلی آئی۔ کھیتی باڑی شروع کرنے سے پہلے ہر آدمی شکاری تھا۔ یہ کام مرد ہی کرتے تھے۔ عورتیں صرف بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں، یا پھل پھلاری چن لاتی تھیں۔ کھیتی باڑی کا دور شروع ہوتے ہی کاموں

کی نوعیت بھی بدل گئی۔ کھیت میں کام ہوتا، شکار کیا جاتا، اور جانوروں کی دیکھ بھال کی بھی ضرورت ہوتی۔

عورتوں کا کام شاید جانوروں کی دیکھ بھال اور گائے کا دودھ دوہنا رہا ہوگا۔ کچھ مرد ایک طرح کا کام کرتے اور کچھ دوسری طرح کا۔

تم دیکھتی ہو کہ آج کی دنیا میں ہر آدمی ایک مخصوص قسم ہی کا کام کرتا ہے۔ ایک آدمی ڈاکٹر ہوتا ہے، یا انجنیر ہوتا ہے جو پُل اور سڑکیں بناتا ہے، یا بڑھئی،

یا لوہار، یا راج ہوتا ہے جو عمارتیں بناتا ہے، یا درزی یا موچی ہوتا ہے، جو اسی طرح کا کوئی اور کام کرتا ہے۔ بس ہر آدمی کا ایک مخصوص پیشہ ہوتا ہے، اور دوسرے پیشوں کی بابت وہ بہت کم یا کچھ نہیں جانتا۔ اسی کو محنت کی، یا کام کی تقسیم کہتے ہیں۔ ایک آدمی اگر ایک ہی پیشہ اختیار کرے تو وہ بہت اچھا کام کرسکے گا، لیکن بہت سے کام اس نے شروع کر دیئے تو وہ کوئی کام بھی ٹھیک سے نہ کرسکے گا۔ آج کی دنیا میں کام کی تقسیم بہت زیادہ رایج ہے۔

کھیتی باڑی شروع ہوتے ہی پرانے زمانے کے قبیلوں میں بھی تقسیم کار کی شروعات ہوگئی۔

*

ہی پہاڑ پر۔

اس مجموعے کے آخری تین خطوں میں ایک نئے دور کی باتیں ہیں، جو اس جگہ کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں بھی میں نے اس خیال سے شامل کر لیا ہے کہ ان میں کچھ اضافہ کرنے کا شاید ہی مجھے موقع مل سکے۔

مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ یہ خطوط چوں کہ انگریزی میں لکھے گئے تھے، اس لیے ان کے پڑھنے والے بھی کم ہی ہوں گے۔ اس میں قصور میرا ہی ہے، اور اب میرے پاس اس کا صرف یہی علاج ہے کہ ان کا ترجمہ کراؤں۔

الہ آباد
نومبر ۱۹۲۹ء

جواہر لال نہرو

کھیتی باڑی سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں

میں نے پچھلے خط میں کام کی تقسیم کے بارے میں کچھ باتیں تمھیں بتلائی تھیں۔ بالکل ابتدائی زمانے میں، جب انسان صرف شکار ہی پر گزر بسر کرتا تھا، تو کام کی معمولی سی تقسیم ہوئی تھی۔ اس وقت تک ہر آدمی شکار کرتا تھا، اور مشکل ہی سے پیٹ بھر کھانا اُسے ملتا تھا۔ کام کی تقسیم سب سے پہلے مردوں اور عورتوں کے درمیان ہوئی ہوگی۔ مرد شکار کے لیے نکلتے رہے ہوں گے اور عورتیں گھر میں رہ کر بچوں کی اور پالتو جانوروں کی دیکھ بھال کرتی رہی ہوں گی۔

آدمی نے جب کھیتی باڑی سیکھ لی تو نئی نئی تبدیلیاں آئیں۔ اب پہلی بار کام کی اور زیادہ تقسیم ہوئی۔ کچھ لوگ شکار کے لیے نکلتے، اور باقی سب جوتتے بوتے اور کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے بعض نئے کام سیکھے اور ان میں مہارت

حاصل کی۔

کھیتی باڑی کرنے کا ایک دل چسپ نتیجہ یہ بھی ہوا کہ آدمیوں نے گاؤں اور بستیاں بسانی شروع کیں۔ کھیتی باڑی کرنے سے پہلے لوگ شکار کرتے اور اِدھر اُدھر گھوما پھرا کرتے تھے۔ ایک ہی جگہ پر جم کر رہنا اُن کے لیے ضروری نہیں تھا۔ جہاں چاہتے وہ شکار کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی تو گائے، بھیڑ اور دوسرے جانوروں کی وجہ سے بھی انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا، کیوں کہ ان جانوروں کے لیے چراگاہوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک جگہ پر کچھ دنوں تک چرنے کے بعد وہاں جانوروں کے لیے زیادہ چارہ تو رہ نہ جاتا، اس لیے پورے قبیلے کو کسی دوسری جگہ جانا پڑتا۔

کھیتی شروع کرنے کے بعد لوگوں کو اپنے کھیتوں کے قریب ہی رہنا پڑا۔ جس زمین کو انھوں نے جوتا بویا تھا، اسے چھوڑ کر وہ کہیں اور جا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ایک فصل سے دوسری فصل تک انھیں ایک ہی جگہ رہنا پڑا، اور اس طرح سے گاؤں اور شہروں کی داغ بیل پڑی۔

کھیتی باڑی سے دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ اس کی وجہ سے زندگی کچھ آسان ہوگئی۔ ہر وقت شکار کی فکر میں سرگرداں رہنے کے مقابلے میں کھیتی کر کے غذا حاصل کرنا کہیں آسان تھا۔ زمین ان کے لیے اتنی غذا پیدا کر دیتی تھی جسے اک بارگی وہ کھا کر ختم نہیں کر سکتے تھے، اس لیے پیداوار کو حفاظت کے ساتھ رکھا بھی جانے لگا۔

اب ایک اور دل چسپ تبدیلی ہمیں نظر آئے گی۔ آدمی جب صرف سیدھا سادھا شکاری تھا، اس وقت کوئی چیز وہ جمع کر کے رکھ نہیں سکتا تھا، اور اگر رکھتا بھی تو اس کی مقدار کسی طرح بھی زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ بس پیٹ ہی بھر کھانا اس کے پاس ہوتا تھا۔ اس وقت بینک بھی نہیں تھے، جہاں وہ پیسہ کوڑی یا اپنی دوسری چیزیں جمع کرتا۔ وہ تو بس ہر روز شکار کر کے اپنا پیٹ پال لیتا تھا۔ کھیتی باڑی شروع کرنے کے بعد اُسے اپنی ضرورت سے زیادہ زمین سے مل جاتا تھا۔ اس زاید غذا کو بچا کر وہ جمع کرنے لگا۔ یہیں سے زاید غذا کے جمع کرنے کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ زاید غذا اس لیے آدمیوں کی ملتی تھی کہ اپنی ضرورت بھر کی غذا پیدا کرنے کے لیے جتنی محنت کی ضرورت تھی، اس سے کچھ زیادہ

محنت وہ کرتے تھے۔

تم جانتی ہو کہ اب ہم لوگوں کے یہاں بینک ہیں۔ لوگ بینکوں میں روپیہ جمع کرتے ہیں، اور چیک بھر کر روپیہ نکالتے ہیں۔ یہ روپیہ آتا کہاں سے ہے؟ اگر تم غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب زاید روپیہ ہے۔ لوگ ایک ہی وقت میں سارا روپیہ صرف کرنا نہیں چاہتے، اس سے فاضل روپے کو وہ بینکوں میں رکھ دیتے ہیں۔ امیر لوگ وہی ہیں جن کے پاس بہت سا فاضل روپیہ ہوتا ہے، اور غریب لوگوں کے پاس یہ فاضل روپیہ بالکل نہیں ہوتا۔ آگے چل کر تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ فاضل روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں آتا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے زیادہ کام کرتا ہے، بلکہ آج کل یہ فاضل رقم اس کے پاس ہوتی ہے، جو بالکل کام نہیں کرتا، اور سخت محنت کرنے والے کو اس فاضل روپے کا کوئی حصہ نہیں ملتا۔ یہ بڑا مہمل سا انتظام ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مہمل انتظام ہی کی وجہ سے آج دنیا میں اتنے غریب لوگ ہیں۔ ان باتوں کو سمجھنے میں ابھی تمھیں کچھ دشواری محسوس ہوگی۔ اس کو سمجھنے کی فکر میں تم

پریشان نہ ہو۔ کیوں کہ یہ باتیں بھی جلد ہی تمھاری سمجھ میں آنے لگیں گی۔

ابھی تو میں یہی چاہوں گا کہ تم صرف اتنی سی بات سمجھ لو کہ کھیتی باڑی شروع ہونے کے بعد آدمی نے اتنی غذا پیدا کرنی شروع کر دی، جسے وہ اک بار گی کھا نہیں سکتا تھا، اس لیے وہ جمع کی جانے لگی۔ اس زمانے میں نہ تو بینک ہی تھے اور نہ روپیہ تھا۔ امیر وہی لوگ کہلاتے تھے، جن کے پاس بہت سی گائیں، یا بھیڑیں، یا اونٹ ہوتے تھے، یا بہت سا غلہ ہوتا تھا۔

شیخ - قبیلے کا سردار کیسے بنا!

مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط کچھ پیچیدہ سے ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہمارے گرد و پیش کی زندگی بھی تو بڑی ہی پیچیدہ ہے۔ پرانے زمانے میں زندگی بہت سیدھی سادھی تھی، لیکن اِس وقت تو ہم اُس زمانے کے حالات پر غور کریں گے، جب زندگی پہلے پہل پیچیدہ ہونا شروع ہوئی تھی۔ سماج میں جو تبدیلیاں آئیں، انھیں ہم اگر آہستہ آہستہ کریدیں اور سمجھنے کی کوشش کریں، تو یہ سب باتیں آسانی سے آج ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اگر ہم نے یہ نہ کیا تو وہ باتیں بھی ہم ہرگز نہ سمجھ سکیں گے جو ہمارے گرد و پیش ہو رہی ہیں، اور ہمارا اُس بچّے کا سا حال ہوگا، جو کسی گھنے جنگل میں کھو گیا ہو۔ اسی لیے میں تمھیں آج جنگل کے سرے پر لے چلتا ہوں، تاکہ وہاں سے نکلنے کا راستہ ہمیں معلوم ہو سکے۔

تمھیں یاد ہوگا کہ مسوری میں تم نے بادشاہوں کے بارے میں مجھ سے سوال کیا تھا، اور پوچھا تھا کہ وہ کیا تھے، اور کیسے بادشاہ بن گئے تھے۔ اب ہم اُس زمانے کی ایک جھلک دیکھیں گے، جب بادشاہ بننے شروع ہوئے تھے۔ پہلے پہل انھیں بادشاہ نہیں کہا جاتا تھا، لیکن جب ان کا کچھ حال معلوم ہو جائے، تو یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ بادشاہ بننا شروع کیسے ہوئے۔

قبیلوں کے بننے کا حال میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ کھیتی باڑی شروع ہونے کے بعد جب کام کی تقسیم عمل میں آئی، تو اس کی ضرورت بھی پیش آئی کہ قبیلے کا کوئی ایک آدمی سب کاموں کی دیکھ بھال اور انتظام کرے۔ لیکن اس سے پہلے بھی ہر قبیلے کو ایسے ہی ایک آدمی کی اس وقت ضرورت ہوا کرتی تھی، جب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے جنگ کرتا۔ تاکہ میدان جنگ میں وہ ان کی رہنمائی کرے۔ یہ رہنما قبیلے کا سب سے بوڑھا آدمی ہوا کرتا تھا، جسے 'شیخ' کہا جاتا، یا کم از کم ہم اسے شیخ ہی کہیں گے۔ بوڑھے ہونے کی وجہ سے اُسے سب سے زیادہ تجربے کار اور دانا سمجھا جاتا۔ لیکن یہ شیخ قبیلے کے دوسرے آدمیوں سے کچھ مختلف نہیں ہوتا تھا۔

سب کے ساتھ مل کر وہ بھی کام کاج کرتا، اور جو کچھ پیدا ہوتا، وہ قبیلے کے سب آدمیوں میں برابر بانٹ دیا جاتا۔ ہر چیز پورے قبیلے کی ملکیت ہوتی۔ اس وقت ہمارے آج کے زمانے جیسا حال نہیں تھا کہ ہر شخص کا الگ مکان، الگ روپیہ پیسہ اور دوسری تمام چیزیں الگ ہوں۔ ایک آدمی جو کچھ پیدا کرتا اُسے پورے قبیلے میں باٹ دیا جاتا، کیوں کہ وہ پورے قبیلے کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ وہی شیخ، یا اُسے منتظم کہہ لو، باٹنے کی خدمت انجام دیتا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ اور تبدیلیاں آئیں، اور کام بڑھے، خصوصاً کھیتی باڑی کی وجہ سے۔ اب شیخ کا زیادہ وقت کاموں کی تنظیم اور اس بات کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا کہ قبیلے کا ہر آدمی ٹھیک ٹھیک کام کرے۔ چناں چہ شیخ کو رفتہ رفتہ اپنے وہ کام چھوڑنے پڑے، جو قبیلے کے اور تمام لوگوں کی طرح وہ بھی کیا کرتا تھا۔ اس طرح سے شیخ قبیلے کے دوسرے تمام لوگوں سے بالکل مختلف بن گیا۔ اب ہمیں کاموں کی یا محنت کی ایک نئی تقسیم نظر آتی ہے۔ شیخ انتظام کرتا ہے، لوگوں کو کام کرنے کی ہدایتیں دیتا ہے، اور دوسرے تمام لوگ کھیتوں

میں کام کرتے ہیں، شکار کے لیے نکلتے ہیں، لڑنے جاتے ہیں، اور سب لوگ اپنے سردار، شیخ کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ دو قبیلوں میں جب جھڑپ یا جنگ ہوتی، تو شیخ کے اختیارات اور بڑھ جاتے، کیوں کہ لڑائی کے زمانے میں بغیر لیڈر کے اچھی طرح جنگ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے شیخ بہت زیادہ بااختیار ہوگیا۔

کاموں کی تنظیم جب بڑھی تو تنہا شیخ ہی کے لیے سب کاموں کا کرنا ممکن نہیں رہا۔ اپنی مدد کے لیے اس نے کچھ لوگوں کو چُننا شروع کیا۔ اس طرح بہت سے منتظم پیدا ہوگئے، لیکن شیخ یقیناً ان سب کا منتظم عالا رہا۔ اب سماج منتظموں اور معمولی کام کرنے والوں میں تقسیم ہوگئی، اور قبیلے میں پہلے جو مساوات تھی، وہ باقی نہ رہی۔ انتظام کرنے والوں کو ان سب پر اقتدار حاصل ہوگیا، جو عام کام کرنے والے تھے۔

شیخ نے ترقی کے جو مدارج طے کیے اس کا حال ہم اگلے خط میں پڑھیں گے۔

*

دُوسرے ایڈیشن کا دِیباچہ

یہ خطوط جس کو لکھے گئے تھے اس کے علاوہ دوسرے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ایک زمانے تک مجھے پس و پیش رہا، لیکن اخباروں نے، اور ان سے بھی بڑھ کر عام پڑھنے والوں نے، جس طرح انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اس سے میری بڑی ہمّت افزائی ہوئی، اور میرے اندیشے بھی دُور ہوئے۔ پہلا ایڈیشن ایک زمانہ ہوا ختم ہو چکا ہے، اور تو اور خود مُصنّف کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اسی لیے اب اس کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا جا رہا ہے۔ دو چار چھوٹی موٹی غلطیوں کو ٹھیک کرنے کے علاوہ اس میں اور کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

اس چھوٹی سی کتاب کی مقبولیت کو دیکھ کر اس میں کچھ اور خطوں کا اضافہ کرنے کی اُمنگ بھی میرے اندر پیدا ہوئی تھی، لیکن میں نے ایک شکّی آقا کی بندگی اختیار کر لی ہے، جو اپنی ہی خدمت گزاری میں ہر وقت مجھے لگائے رکھتا ہے، اور خود میرا دل بھی نہیں چاہتا کہ کسی اور کام کو ہاتھ لگاؤں۔ پچھلے سال جب میں نینی جیل میں تھا تو یہ خطوط

شیخ کی ترقی

پرانے قبیلوں اور ان کے شیخوں کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ تمھیں زیادہ غیر دل چسپ نہ معلوم ہوا ہوگا۔ میں نے پچھلے خط میں تمھیں بتایا تھا کہ ان دنوں میں ہر چیز کسی ایک فرد کی نہیں، بلکہ پورے قبیلے کی ملکیت ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ شیخ کے لیے بھی کوئی چیز مخصوص نہیں تھی۔ قبیلے کے ایک فرد کی طرح اسے بھی اتنا ہی ملتا، جتنا کسی اور کو۔ لیکن وہ منتظم ہونے کی وجہ سے قبیلے کی تمام چیزوں کا، اور جائیداد کا رکھوالا ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات جوں جوں بڑھے، وہ یہ سمجھنے لگا کہ تمام چیزوں کا وہ مالک ہے اور ساری جائیداد قبیلے کی نہیں، بلکہ خود اس کی اپنی ہے۔ یا وہ یہ سمجھنے لگا کہ چوں کہ وہ خود قبیلے کا سردار ہے، اس لیے وہی قبیلے کا نمائندہ بھی ہے۔ اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ خود اپنی ذات کے لیے چیزوں کا

مالک بن بیٹھنے کا تصور کیوں کر پیدا ہوا۔ آج تو ہم برابر کہا کرتے ہیں کہ فلاں چیز 'میری' ہے، یا 'تمھاری' ہے۔ لیکن، میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ابتدائی قبیلوں کے مردوں اور عورتوں کے سوچنے کا یہ ڈھنگ نہیں تھا۔ اس وقت تک تو ہر چیز قبیلے کی ہوتی تھی۔

ہاں تو بوڑھا شیخ بہرکیف یہ سمجھنے لگا کہ وہ خود قبیلہ ہے، اور قبیلے کی ہر چیز اس کی اپنی ہے۔

شیخ کے مرنے کے بعد قبیلے کے سارے لوگ جمع ہوتے، اور اپنا ایک نیا لیڈر — یا شیخ چن لیتے۔ شیخ کے گھرانے کے لوگ، اور تمام لوگوں کے مقابلے میں، انتظامی کاموں سے زیادہ واقف ہوتے تھے، کیوں کہ ہر وقت شیخ کے ساتھ رہنے اور اس کا ہاتھ بٹانے کی وجہ سے وہ بھی کاموں سے واقف ہو جاتے تھے۔ چناں چہ یہ ہونے لگا کہ شیخ کے مرنے کے بعد اسی کے خاندان کے کسی آدمی کو شیخ چن لیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبیلے کے اور تمام خاندانوں سے شیخ کا خاندان بالکل مختلف ہو گیا، اور لوگوں نے اسی خاندان سے شیخ چننے شروع کر دیئے۔

اب شیخ کے اختیارات بڑھ گئے، اور قدرتاً یہ خواہش اس کے اندر پیدا ہونے لگی کہ اس کے بیٹے یا بھائی ہی کو

اس کا جانشین چنا جائے، اور یہ خواہش پوری کرنے کے لیے اس نے کوشش کرنی شروع کی۔ چناں چہ اپنے بیٹے، بھائی یا کسی قریبی عزیز کو اس نے کام سکھلانا شروع کر دیا، تاکہ وہ اس کی جانشینی کا اہل بن جائے۔ بلکہ قبیلے والوں سے وہ کہہ بھی دیا کرتا تھا کہ فلاں آدمی کو انتخاب کر کے اس نے کام کی تعلیم دے دی ہے، اس لیے اسی کو اس کا جانشین چن لیا جائے۔ شروع شروع میں تو قبیلے والوں شیخ کی یہ بات پسند نہ آئی ہوگی، لیکن پھر وہ اس کے عادی ہو گئے ہوں گے، جو شیخ نے کہہ دیا ہوگا۔ اب شیخ کے الکشن ـــــ انتخاب یا چننے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ کیوں کہ بوڑھا شیخ خود ہی اپنے جانشین کا انتخاب کر لیتا تھا، اور وہی کامیاب ہوا کرتا تھا۔

اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ شیخ کا عہدہ اب موروثی بن کر ایک ہی خاندان تک محدود ہوگیا۔ باپ کے بعد بیٹا، یا اس کا کوئی قریبی عزیز شیخ بن جاتا۔ شیخ کو اب اس بات کا بھی پورا یقین ہوگیا کہ دراصل قبیلے کا تمام سامان اسی کا ہے، اور ساری جائیداد کا بھی وہی مالک ہے، اور یہ سب چیزیں اس کے

بعد بھی اسی کے خاندان میں رہیں گی۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز 'میری' ہے، اور فلاں چیز 'تمھاری' ہے — یعنی ملکیت کا تصور بھی یہیں سے شروع ہوا۔ ابتدا میں اس طرح کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ سب لوگ مل جل کر، اپنی ذات کے لیے نہیں، بلکہ پورے قبیلے کے لیے کام کرتے تھے۔ اگر انھوں نے بہت سی غذا، یا کوئی اور چیز، پیدا کی تو قبیلے کے ہر فرد میں وہ تقسیم ہوجاتی تھی۔ قبیلے میں کوئی امیر یا کوئی غریب نہیں ہوتا تھا۔ قبیلے کی ساری املاک میں سب برابر کے حصے دار ہوتے تھے۔ لیکن جوں ہی شیخ نے قبیلے کی املاک کو اپنی ذاتی ملکیت بنانا شروع کیا، لوگ امیر اور غریب بننے لگے۔

میں اس کے بارے میں اپنے اگلے خط میں لکھوں گا۔

*

شیخ بادشاہ بن بیٹھا

بوڑھے شیخ کے قصے نے ہمارا بہت سا وقت لے لیا۔ ہے نا یہی بات ؟ لیکن یہ کہانی اب ختم ہونے ہی والی ہے۔ شیخ اپنا پرانا نام چھوڑ کر اب نیا نام اختیار کرے گا۔ شیخ کا قصہ شروع کرتے ہوئے میں نے یہ بتانے کا تم سے وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ کیوں کر بنے، اور پہلے وہ کیا تھے۔ بات یہ ہے کہ بادشاہوں کو سمجھنے کے لیے شیخ کے زمانے تک جانا ضروری تھا۔ یہ تو تم نے اب سمجھ ہی لیا ہوگا کہ یہی شیخ آگے چل کر بادشاہ یا راجا مہاراجا بن بیٹھے۔ 'شیخ' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں 'سردار' یا 'بزرگ' ـــــ جو باپ کے برابر ہوتا ہے۔ شیخ اپنے قبیلے کا بزرگ یا باپ ہی ہوتا تھا۔ انگریزی میں شیخ کو 'پیٹرِی یارخ' (Patriarch) کہتے ہیں، جو لاطینی زبان کے لفظ 'پیٹر' (Pater) سے نکلا ہے، اور جس کے معنی ہیں 'باپ'۔ اسی سے

ایک دوسرا لفظ 'پاتریا' (Patria) بنا، جس کے معنی ہیں 'باپ کی سرزمین' یا 'وطن'۔ فرانسیسی زبان میں یہی لفظ، وطن کے معنوں میں، پاتر (Patrie) بن گیا۔ ہمارے یہاں وطن کو 'باپ' نہیں بلکہ 'ماں' سمجھا جاتا ہے، اسی سے سنسکرت اور ہندی میں وطن کے لیے 'ماترِبھومی' (मातृभूमि) کا لفظ، یعنی 'مادرِ وطن' استعمال کیا جاتا ہے۔ تم وطن کو 'باپ' کہنا پسند کروگی یا 'ماں'؟

ہاں! تو شیخ کا عہدہ جب موروثی بن گیا، یعنی باپ کی جگہ بیٹا لینے لگا، تو شیخ اور بادشاہ میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اور پھر بادشاہ کے ذہن میں یہ بات بھی بیٹھ گئی کہ سارے ملک میں جو کچھ بھی ہے، اسی کا ہے۔ وہ خود ہی ملک ہے، بلکہ وہی سب کچھ ہے۔ فرانس کے ایک مشہور بادشاہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "میں ہی ریاست ہوں" — یعنی میں ہی ملک اور اس کی حکومت ہوں۔ بادشاہوں نے یہ بات بھلا دی کہ لوگوں نے تو انھیں اس لیے چنا تھا کہ وہ انتظام کریں اور کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا سامان لوگوں میں تقسیم کیا کریں۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ لوگوں نے انھیں اس لیے انتخاب کیا تھا کہ پورے

قبیلے، یا پورے ملک میں وہی سب سے زیادہ تجربہ کار اور سمجھ دار سمجھے گئے تھے۔ لیکن وہ تو اپنے کو آقا اور دوسروں کو اپنا نوکر سمجھ بیٹھے، اگرچہ وہ خود پورے ملک کے نوکر تھے۔

آگے چل کر، جب تم تاریخ پڑھوگی، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ بادشاہ اتنے خودسر ہوگئے کہ وہ سمجھنے لگے کہ ان کے چُنے جانے میں عام لوگوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ کہتے کہ انھیں تو خدا نے بادشاہ بنایا ہے، اور انھوں نے اپنے عہدے کو 'خداوندی حق' کا نام دے دیا۔ ایک زمانے تک وہ من مانی اور عیش و آرام کرتے رہے، اور ان کی قوم کے لوگ بھوکوں مرتے رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ بھر گیا، اور بعض ملکوں میں تو لوگوں نے بادشاہ کو مار بھگایا۔ تم آگے چل کر پڑھوگی کہ انگلستان والوں نے اپنے بادشاہ چارلس اول[1] کے خلاف بغاوت کر کے اسے شکست دی، اور قتل کر دیا۔ فرانس میں انقلاب ہوا، اور لوگوں نے

۱۔ انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کو اس کی باغی رعایا نے ۳۰ جنوری ۱۶۴۹ء میں قتل کر دیا تھا۔

طے کیا کہ وہاں اب کوئی بادشاہ نہ ہوگا۔[2] تمھیں یاد ہوگا کہ پیرس میں ہم لوگ ایک قید خانہ (Conciergerie prison) دیکھنے گئے تھے۔ تم ہمارے ساتھ تھیں نا؟ اسی قید خانے میں شاہی خاندان کے لوگ اور ملکہ میری انتونی (Marie Antoinette) رکھی گئی تھی۔ روس کے اس عظیم انقلاب کے بارے میں بھی تم پڑھوگی، جب کہ روس کے لوگوں نے، ابھی چند ہی سال ہوئے، اپنے بادشاہ کو، جسے زار کہتے تھے، نکال باہر کیا۔[3]

ہاں! تو بادشاہوں کا بھی ایک دور تھا، اب بہت سے ملکوں میں بادشاہت ختم ہوچکی ہے۔ فرانس، جرمنی، روس، سوئزرلینڈ، امریکا، چین اور بہت سے ملکوں میں اب کوئی بھی بادشاہ نہیں[4]! وہاں جمہوری۔

۲۔ فرانس میں انقلاب ۱۷۸۹ء میں ہوا تھا۔

۳۔ یہ قصہ ۱۹۱۷ء کا ہے۔

۴۔ اب ہمارا ملک، ہندستان، بھی ایک جمہوری ملک ہے، جہاں ہر پانچ سال کے بعد پارلی منٹ اور اسمبلیوں کے ممبر چنے جاتے ہیں، جو ملک کا انتظام چلاتے ہیں۔

عوامی حکومتیں ہیں، اور وہاں عام لوگ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد سرکار چلانے والوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہاں موروثی بادشاہت نہیں ہے۔

تم جانتی ہو، انگلستان میں تو اب تک بادشاہت ہے، لیکن بادشاہ کے اختیارات کچھ نہیں ہیں۔ وہ بس تھوڑے ہی سے کام کرسکتا ہے۔ سارے اختیارات پارلی منٹ کے ہاتھ میں ہیں، جہاں لوگوں کے چنے ہوئے نمائندے بیٹھتے ہیں۔ لندن کی پارلی منٹ تو تمھیں یاد ہوگی، جو تم نے دیکھی تھی۔

ہندستان میں آج بھی بہت سے راجے مہاراجے اور نواب ہیں[۵]، جو اچھے اچھے کپڑے پہنے، قیمتی موٹروں میں گھومتے تمھیں نظر آتے ہیں، اور جو اپنی ذات پر بہت سا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ انھیں اتنی دولت کہاں سے ملتی ہے؟ لوگوں پر ٹیکس لگاکر وہ یہ دولت پیدا کرتے ہیں۔ ٹیکس تو اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے اسکول، اسپتال، لائبریریاں،

۵۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہندستان آزاد ہوا، تو اس کے ساتھ ہی راجاؤں مہاراجوں کی حکومت بھی ختم ہوگئی۔

عجائب خانے، اچھی اچھی سڑکیں بنائی جائیں اور لوگوں کی بھلائی کے دوسرے سب کام کیے جائیں۔ لیکن ہمارے راجے مہاراجے بھی وہی سمجھتے ہیں، جو فرانس کے ایک بادشاہ نے کہا تھا کہ — "میں ہی ریاست ہوں"۔ اور عام لوگوں کا روپیہ اپنے عیش و عشرت پر صَرف کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ خود تو عیش کرتے ہیں، اور دوسری طرف ان کی رعایا، جو اپنے خون پسینے کی کمائی کا روپیہ ان کو دیتی ہے، فاقے کرتی ہے، اور ان کے بچّوں کی کے لیے اسکول تک نہیں ہیں۔

*

مجھے پھر یاد آئے۔ وقت کی بھی وہاں کمی نہیں تھی، لیکن ایک تو جیل خانے سے زیادہ خط نہیں لکھے جا سکتے، اور دوسرے حوالے کے لیے کتابیں بھی وہاں نہیں ملتیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آئے دن کے واقعات سے جو نئی تاریخ ہندستان میں بن رہی ہے، میں اس میں اتنا مگن تھا کہ اگلے وقتوں کی گزری ہوئی باتوں کی طرف دھیان دینا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں جیل سے باہر آیا اور ایک ہفتے کی مختصر غیر حاضری کے بعد پھر وہیں لوٹ گیا، اور مہینوں پر مہینے بیتتے گئے۔ اس سال پہلی جنوری کو نئے سال کے موقع پر ان خطوں کا سلسلہ پھر شروع کرنے کا میں نے عہد کیا۔ یہ سلسلہ ابھی کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ یکایک مجھے رہا کر دیا گیا۔ لیکن چھوٹتے ہی گھریلو زندگی کے بکھیڑوں اور سیاسی اُلجھنوں میں پھنس گیا، اور ان کی طوفانی موجیں مجھے اِدھر اُدھر اُچھالتی پھینکتی رہیں۔ خطوں کے اس سلسلے کو ختم کرنے کے لیے اب پھر جیل کی کوٹھری کے سکوت و سکون ہی کا منتظر ہوں۔

ساتھ ہی ساتھ اندیرا بھی بڑی ہو رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی دن پر دن بڑھتی ہوئی معلومات سے قدم ملا کر میں شاید ہی چل سکوں۔

جواہر لال نہرو

الہ آباد

اکتوبر ۱۹۳۱ء

ابتدائی دَور کا تمدّن

شیخوں اور بادشاہوں کے بارے میں، فی الحال، ہم بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ آؤ پھر ہم کچھ پیچھے کی طرف چلیں اور دیکھیں کہ ابتدائی زمانے کے لوگوں کا تمدّن —— رہن سہن، رنگ ڈھنگ کیسا تھا، اور وہ سب کس طرح زندگی بسر کرتے تھے!

ابتدائی زمانے کے اِن آدمیوں کے بارے میں بہت کم باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ لیکن 'قدیم پتھر کے دور کے آدمی' اور 'نئے پتھر کے دور کے آدمی' کے حالات کے مقابلے میں ہم ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہزاروں برس پہلے جو عمارتیں انھوں نے بنائی تھیں، ان کے کھنڈر، آج بھی موجود ہیں۔ ان عمارتوں، مندروں اور محلوں کو دیکھ ہم کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ابتدائی زمانے کے انسان کس طرح کے تھے، اور وہ کیا کیا کرتے تھے۔ ان

پرانی عمارتوں میں جو مجسمے اور سنگ تراشی کے نمونے ملتے ہیں، ان لوگوں کو سمجھنے میں ہماری خاص طور سے مدد کرتے ہیں۔ ان مجسموں کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ کس قسم کا لباس، اور دوسری بہت سی چیزیں، پہنا کرتے تھے۔

ہم یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی پہلے پہل کہاں آباد ہوئے اور ان میں تمدن کیسے پیدا ہوا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بحر اٹلانٹک (Atlantic) میں ایک بہت بڑا ملک تھا، جسے اٹلانٹس (Atlantis) کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کا تمدن بہت ترقی پر تھا، مگر کسی وجہ سے یہ پورا ملک بحر اٹلانٹک میں ڈوب گیا، اور اس کا کوئی چپّہ بھی باقی نہ رہا۔ لیکن اس کا ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے، صرف قصے ہی ہیں۔ اس لیے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں، اور ہم اِسے نظرانداز کرتے ہیں۔

کچھ لوگ ہمیں یہ بھی بتلاتے ہیں کہ پرانے زمانے میں امریکا میں بھی بڑے ترقی یافتہ تمدن تھے۔ تمھیں معلوم ہے! کہا جاتا ہے کہ کولمبس نے امریکا کا پتا لگایا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ

کولمبس کے امریکا پہنچنے سے سیکڑوں سال پہلے کی نقاشی کا ایک نمونہ

سورج دیوتا جسے انسانی دل نکال کر پیش کیا جاتا تھا

کولمبس کے امریکا پہنچنے سے سیکڑوں سال پہلے کی ایک عمارت کا کھنڈر

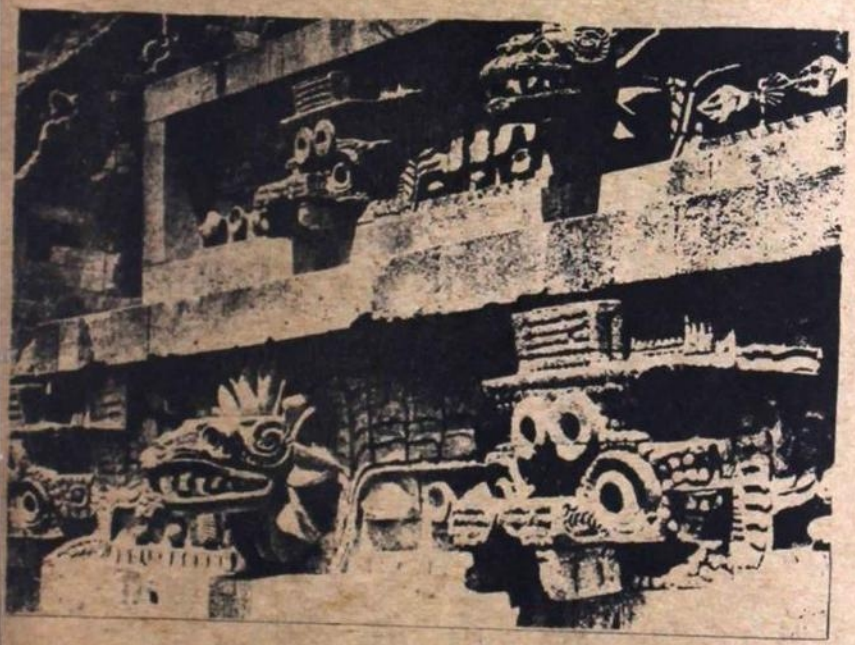

کولمبس کے وہاں پہنچنے سے پہلے امریکا تھا ہی نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کولمبس کے امریکا پہنچنے سے پہلے یورپ کے لوگ اس کے وجود سے واقف نہیں تھے۔ کولمبس کے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے بھی لوگ وہاں آباد تھے اور کسی نہ کسی قسم کا تمدن بھی وہاں تھا۔ شمالی امریکا میں، میکسیکو (Mexico) کے قریب یوکاٹن (Yukatan) میں، اور جنوبی امریکا میں، پی رُو (Peru) میں بہت پرانی عمارتوں کے کھنڈر ہمیں ملتے ہیں۔ اس لیے ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ بہت قدیم زمانے میں جو لوگ پی رُو اور یُوکاٹن میں رہتے تھے، وہ متمدّن ـــــ تہذیب یافتہ تھے۔ لیکن اس سے زیادہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ ابھی ہمیں ان کے متعلق

۱۔ ۱۴۹۲ء میں کرسٹافر کولمبس (Christopher Columbus) اسپین کا باشندہ، ہندستان کے سمندری راستے کی تلاش میں نکلا، لیکن قسمت نے اسے ہندستان کی جگہ پر براعظم امریکا کے ایک جزیرے میں جا اُتارا۔ اس کے بعد ہی یورپ والوں نے امریکا کو اپنی نوآبادی بنالیا۔

زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر اور زیادہ باتیں ہمیں معلوم ہوں۔

یورپ اور ایشیا کو ملاکر 'یوریشیا' (Eurasia) کہا جاتا ہے۔ وہاں سب سے پہلے غالباً عراق، مصر، کریٹ، ہندستان اور چین میں تمدّن نے جنم لیا۔ مصر کو اب افریقہ میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن ہم اسے 'یوریشیا' میں شامل کرسکتے ہیں، کیوں کہ وہ ان براعظموں سے بہت قریب ہے۔

مارے مارے پھرنے والے پرانے قبیلوں میں جب کسی جگہ آباد ہونے کی خواہش پیدا ہوئی ہوگی، تو کس قسم کی جگہ انھوں نے اپنے لیے چنی ہوگی؟ وہ تو ایسی ہی جگہ رہی ہوگی، جہاں انھیں غذا آسانی سے مل سکے، اور غذا تو کھیتوں ہی سے، کھیتی باڑی کرکے، حاصل کی جاسکتی تھی۔ کھیتی کے لیے پانی کا ہونا ضروری تھا، کیوں کہ بلا پانی کے تو کھیت سوکھ جاتے اور کچھ بھی پیدا نہ ہوتا۔ تمھیں معلوم ہے کہ ہندستان میں بارش کے موسم میں جب زیادہ پانی نہیں برستا تو بہت کم غلہ پیدا ہوتا ہے اور قحط پڑجاتا ہے، اور غریب لوگوں کو کھانا نصیب نہیں ہوتا اور فاقے کرنے لگتے

ہیں۔ اس لیے پانی ضروری ہے۔ ابتدائی دور کے آباد ہونے والوں نے اپنے رہنے کے لیے ایسی ہی جگہیں انتخاب کی ہوں گی، جہاں پانی بہت رہا ہوگا۔ ہمیں پتا چلتا ہے کہ انھوں نے یہی کیا تھا۔

عراق میں وہ لوگ دو دریاؤں ـــــ دجلہ اور فرات، کے درمیانی علاقے میں آباد ہوئے۔ مصر میں انھوں نے دریائے نیل کو چنا۔ ہندستان میں ان کے بیش تر شہر سندھ، گنگا اور جمنا جیسے دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے۔ پانی اُن کے لیے اتنا ضروری تھا کہ دریاؤں کو، جو ان کے لیے افراط سے غذا فراہم کرتے تھے، وہ پُوتر ـــــ پاک اور متبرّک سمجھنے لگے۔ مصر میں دریائے نیل کو "باپ نیل" کہا جاتا تھا اور اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ ہندستان میں تو، تم جانتی ہو گنگا کی پوجا کی جاتی تھی۔ اور آج بھی اُسے متبرّک سمجھا جاتا ہے۔ اُسے 'گنگا مائی' کہتے ہیں، اور تم نے یاتریوں کو 'گنگا مائی کی جے' پکارتے ہوئے بھی سنا ہوگا۔ دریاؤں کی پرستش کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان دریاؤں سے اُنھیں اتنا کچھ ملتا تھا۔ صرف پانی ہی نہیں بلکہ عمدہ مٹی اور ریت بھی، یہ دریا انھیں

دیتے تھے، جس سے ان کے کھیتوں کی زرخیزی بڑھ جاتی تھی۔ دریاؤں کے پانی اور مٹی کی وجہ سے بہت زیادہ غلہ پیدا ہوتا تھا۔ اس لیے دریاؤں کو 'ماں' یا 'باپ' کہنا غلط نہیں تھا۔ لیکن لوگوں میں یہ بات بھول جانے کی عادت ہے کہ وہ کوئی کام کس وجہ سے کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ دریائے نیل اور دریائے گنگا کو متبرک اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ ان سے پانی اور غلہ ملتا ہے۔

*

پُرانی دُنیا کے بڑے بڑے شہر

ہم نے دیکھا ہے کہ آدمی پہلے بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے، اور زرخیز وادیوں میں آباد ہوئے، جہاں کھانے کا سامان اور پانی انھیں افراط سے مل سکتا تھا۔ اپنے بڑے شہر بھی وہ دریا ہی کے کنارے بسایا کرتے تھے۔ بعض پرانے بڑے شہروں کے نام تو تم نے بھی ضرور سُنے ہوں گے۔ عراق میں اس طرح کے شہر — بابل، نینوا، اور آشور تھے۔ لیکن یہ سارے شہر ایک مدّت ہوئی، ختم ہو چکے ہیں۔ اب بہت گہری کھدائی کے بعد ان کے کھنڈر مل جاتے ہیں۔ ہزاروں برس کے عرصے میں یہ تمام شہر مٹی اور بالو کے نیچے بالکل دب چکے تھے، اور ان کا کوئی نشان بھی باقی نہ تھا۔ بعض جگہ پرانے شہروں کی جگہ پر، جو بالو اور مٹی سے ڈھک چکے تھے، نئے شہر بس گئے۔ چناں چہ پرانی آبادیوں کا کھوج لگانے والوں کو، بہت گہرائی تک

مٹی اور بالو ہٹانے کے بعد تلے اوپر شہر ملے ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک ہی وقت میں تلے اوپر شہر بسائے گئے ہوں، غالباً ہوا یہ ہوگا کہ سیکڑوں برس تک ایک شہر آباد رہا، لوگ وہاں بستے اور مرتے کھپتے رہے۔ اسی طرح ان کے بیٹے، پوتے اور پرپوتے بھی وہاں آباد ہوئے اور وہ بھی اسی مٹی میں ملتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان شہروں کی آبادی کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ بالکل سنسان اور کھنڈر سے بن گئے؛ مٹی اور بالو نے انھیں ڈھک لیا۔ مٹی اور بالو کو ہٹانے والا کوئی نہ رہا، اور پورا شہر مٹی اور بالو کا تودہ بن گیا، اور لوگ یہ بھول بھی گئے کہ اس جگہ کبھی کوئی شہر بھی آباد تھا۔ سیکڑوں برس گزرنے کے بعد کچھ نئے لوگ آئے اور انھوں نے اسی جگہ ایک نیا شہر بسالیا۔ پھر یہ شہر بھی پرانا ہوکر ویران ہوگیا ہوگا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی مٹی اور بالو کے نیچے دب گیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بہت سے شہروں کے کھنڈر ایک دوسرے کے نیچے دبے ہوئے مل جاتے ہیں۔ یہ بات بالعموم ریگستانی علاقوں میں اکثر ہوا کرتی تھی، کیوں کہ بالو بڑی جلدی ہر چیز

کے خط بیٹی کے نام

کو ڈھک لیتا ہے۔

کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ شہر پر شہر قایم ہوں، اور اُن میں مردوں اور عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ آباد ہوں اور پھر دھیرے دھیرے وہ غایب ہوجائیں؛ اسی جگہ نئے شہر آباد ہوں اور لوگوں کے نئے نئے گروہ وہاں رہنا شروع کردیں، اور وہ بھی مرجائیں اور پھر ان کا نشان تک بھی وہاں باقی نہ رہے! میں نے تو چند جملوں میں یہ سب کہہ دیا، لیکن سوچو تو کہ ان شہروں کے بسنے، ویران ہونے، اور ان کی جگہ پر نئے شہروں کے آباد ہونے میں ہزاروں برس لگے ہوں گے۔ کوئی آدمی ستّر یا اسّی برس کا ہوجاتا ہے تو ہم اُسے بوڑھا کہتے ہیں۔ لیکن ہزاروں برس کے مقابلے میں ستر اسّی برس کی بھلا کیا حقیقت ہے! ان شہروں کی زندگی میں کتنے ہی بار بچّے بوڑھے ہوکر مرے ہوں گے۔ اور اب بابل و نینوا کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے۔

ایک اور پرانا شہر دمشق ہے، جو شام میں ہے۔ یہ ابھی بھی باقی ہے، اور بہت بڑا شہر ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دمشق ہی آج شاید دُنیا کا سب سے پرانا شہر ہے۔

ہندستان میں بھی ہمارے بڑے بڑے شہر دریاؤں ہی کے کنارے آباد ہیں۔ سب سے پرانے شہروں میں ایک اندر پرست بھی تھا، جو دہلی کے قریب آباد تھا۔ اب اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ وارانسی یا کاشی بھی بہت پرانا شہر ہے۔ دنیا میں جو سب سے پرانے شہر ملتے ہیں، ان میں ایک شاید بنارس بھی ہے۔ الہ آباد، کان پور، پٹنہ، اور دوسرے بہت سے شہر جن کے نام تم خود سوچ سکتی ہو، دریا ہی کے کنارے آباد ہیں۔ لیکن یہ بہت پرانے شہر نہیں ہیں، اگرچہ پریاگ یا الہ آباد اور پٹنہ یا پاٹلی پتر — پہلے ان کے یہی نام تھے، خاصے پرانے شہر ہیں۔

اسی طرح چین میں بھی پرانے شہر ملتے ہیں۔

پرانی دنیا کے ایک شہر کا کھنڈر

مصر اور کریٹ

پرانے وقتوں کے شہروں اور گاؤں میں بھلا کس قسم کے لوگ رہا کرتے تھے؟ ان لوگوں نے جو بڑی بڑی عمارتیں بنائی تھیں، انھیں دیکھ کر ہم ان کے بارے میں کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ ہاں! پتھروں کی ان چٹانوں سے بھی ان کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے، جن پر وہ کچھ لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ پھر کچھ بہت پرانی کتابیں بھی ہمارے پاس ہیں، جو ان لوگوں کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتاتی ہیں۔

مصر میں آج بھی اہرام کی عظیم عمارتوں اور ابوالہول کے مجسمے کے علاوہ لکسر اور دوسرے شہروں میں مندروں کے بڑے بڑے کھنڈر ملتے ہیں۔ تم نے انھیں دیکھا نہیں ہے، اگرچہ ولایت سے آتے ہوئے ہمارا جہاز جب سویز کی نہر سے گزرا، تو ان جگہوں سے ہم بہت قریب تھے۔ لیکن تم نے

ان کی تصویریں دیکھی ہیں اور ان کی تصویروں کے پوسٹ کارڈ بھی شاید تمھارے پاس ہوں گے۔ ابوالہول ایک شیر کا مجسمہ ہے، جس کا سر عورتوں کا سا ہے۔ یہ بہت بڑا ہے۔ یہ بات کسی کو نہیں معلوم ہے کہ یہ کیوں تراشا گیا تھا، اور اس کا مطلب کیا ہے۔ اس زنانے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی ہے۔ لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ مسکراہٹ کیوں ہے۔ اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ابوالہول کا سا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ آدمی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

اہرام کی بھی بڑی ہی عظیم عمارتیں ہیں۔ یہ مصر کے اُن قدیم بادشاہوں کے مقبرے ہیں، جنھیں فرعون کہتے تھے۔ مصری ممیاں تمھیں یاد ہیں، جو لندن کے برٹش میوزیم میں تم نے دیکھی تھیں؟ ممی انسان یا جانور کی لاش کو کہتے ہیں، جس پر تیل اور مسالہ لگا دیا گیا ہو، تاکہ وہ سڑنے نہ پائے۔ فرعون جب مرتے تھے، تو ان کی لاش کو ممی بنا کر بڑے بڑے اہرام میں رکھ دیا جاتا تھا، اور ممی کے قریب سونے چاندی کے زیورات، فرنیچر اور کھانے پینے کا

سامان بھی اس خیال سے رکھ دیا جاتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی، ہوسکتا ہے کہ ان چیزوں کی انھیں ضرورت پیش آجائے۔ ابھی چند ہی برس ہوئے ہیں کہ ایک اہرام میں کچھ لوگوں کو ایک فرعون کی لاش ملی ہے، جس کا نام 'توتن خامن' تھا۔ اس کی ممی کے قریب بہت سی خوب صورت اور قیمتی چیزیں بھی رکھی ملی ہیں۔

اس زمانے میں کھیتی اور آب پاشی کے لیے، مصر میں بھی، جھیلیں اور نہریں بناکر لوگ پانی لے جاتے تھے۔ اسی طرح کی ایک مشہور نہر کا نام 'مُرِیدو' تھا، اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پرانے زمانے کے مصری لوگ سمجھ دار اور ترقی یافتہ تھے۔ ان نہروں، جھیلوں اور اہراموں کو بنانے والے قابل انجنیر وہاں رہے ہوں گے۔

بحر روم میں ایک چھوٹا سا جزیرہ، کریٹ (Crete) یا کینڈا (Candia) ہے۔ پورٹ سعید سے وِینس[1] جاتے

۱۔ یورپ کا ایک مشہور اور خوب صورت شہر، جو اٹلی میں ہے۔

ہوئے ہم لوگ اس کے قریب سے گزرے بھی تھے۔ پرانے زمانے میں اس چھوٹے سے جزیرے میں بڑا عمدہ تمدّن موجود تھا۔ کریٹ ہی میں ایک عظیم الشان محل نُوسُوس کے مقام پر تھا، جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ اس محل میں غسل خانے اور پانی کے نل بھی تھے۔ بعض لوگ، جن کی معلومات زیادہ نہیں ہیں، سمجھتے ہیں کہ پانی کے نل آج کل کی ایجاد ہے۔ مٹی کے خوب صورت برتن، مٹی کے مجسمے، تصویریں، دھات اور ہاتھی دانت کے کام کی چیزیں بھی وہاں سے نکلی ہیں۔ کریٹ کے اس چھوٹے سے جزیرے میں لوگ بڑے امن کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے بڑی ترقی کی تھی۔

شہنشاہ میداس (Midas) کے بارے میں تم نے ضرور پڑھا ہوگا۔ جس چیز کو بھی وہ چھوتا، سونے کی بن جاتی۔ اِس کی وجہ سے وہ بڑی پریشانی میں پھنس گیا تھا۔ وہ کھا بھی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ ہاتھ لگاتے ہی اس کا نوالہ بھی سونے کا بن جاتا، اور کھانے کے لیے سونا تو بے مصرف چیز ہے۔ قدرت نے اس کی ہوس کی یہ اُسے سزا دی تھی۔ یہ یقیناً ایک من گڑھت

قصہ ہے ، جس کا مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ سونا اتنی اچھی چیز نہیں ہے ، جتنا کہ لوگ اسے سمجھتے ہیں۔

کریٹ ہی کا ایک اور قصہ بھی تم نے ضرور سنا ہوگا۔ یہ آدم خور دیو منتور (Minotaur) کا قصہ ہے جس کا آدھا جسم انسان کا اور آدھا بیل کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو اُسے کھانے کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ یہ تو میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مذہب کا تخیل کسی لامعلوم چیز کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔ اسی خوف کی وجہ سے، اور قدرت کی باتوں نیز اپنے اردگرد پیش آنے والے، حالات سے ناواقف ہونے کے سبب سے لوگ بڑی احمقانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ لڑکے اور لڑکیوں کی یہ قربانی، میں سمجھتا ہوں ، کسی حقیقی آدم خور دیو کے لیے نہیں ہوسکتی تھی ، کیوں کہ میرے خیال میں، اس طرح کے کسی دیو کا کبھی بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ بھینٹ کسی خیالی دیو کو پیش کی جاتی تھی۔

اس زمانے میں ، دنیا بھر میں آدمیوں کو بھینٹ چڑھانے کا رواج تھا۔ یعنی یہ بھینٹ ان خیالی دیوتاؤں کو لوگ پیش کرتے تھے ، جن کی وہ پرستش

کرتے تھے۔ مصر میں، 'نیل دیوتا' کو خوش کرنے کے لیے، نوجوان لڑکیوں کو دریائے نیل میں پھینک دیا جاتا تھا۔

انسانی قربانی، دنیا کے دور دراز گوشوں میں کبھی ہوجاتی ہو تو ہوجاتی ہو، لیکن خوش قسمتی سے اب اس کا رواج نہیں رہا ہے۔ لیکن دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے لوگ اب بھی جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ پرستش کا یہ کتنا عجیب سا طریقہ ہے۔

★

چین اور ہندستان

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی دور میں تمدّن نے عراق میں، مصر میں اور بحر روم کے چھوٹے سے جزیرے ـــــ کریٹ میں جنم لیا تھا۔ قریب قریب اسی زمانے میں چین اور ہندستان میں بھی بڑی بڑی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور اپنے اپنے ڈھنگ سے پروان چڑھیں۔

چین میں بھی، اور جگہوں کی طرح، لوگ بڑے بڑے دریاؤں کی ترائی میں آباد ہوئے۔ ان لوگوں کو منگول کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے پہلے کانسے کی، اور پھر آگے چل کر لوہے کی، کشتیاں تیار کیں۔ نہریں اور نئی نئی عمارتیں بنائیں اور لکھائی کا ایک نیا طریقہ انھیں معلوم ہوگیا۔ ہم جس طرح سے ہندی، اُردو یا انگریزی لکھتے ہیں، ان کی لکھائی کا طریقہ ان سے بالکل مختلف تھا۔ یہ لکھائی تصویروں سے کی جاتی تھی۔ ہر لفظ اور کبھی کبھی کوئی

کریٹ کے ایک محل کی
دیوار پر قلمی نقاشی

قُدرت کی کِتاب

ہم تم جب ساتھ ہوتے ہیں، تو بہت سی چیزوں کے بارے میں اکثر تم مجھ سے طرح طرح کے سوالات پوچھتی ہو، اور میں ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اب تم مسوری میں ہو اور میں الہ آباد میں۔ ظاہر ہے کہ اب ہماری تمھاری زبانی گفتگو تو ہو نہیں سکتی۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ کبھی کبھی اپنی دُنیا کی کہانی کا اور ان چھوٹے بڑے مُلکوں کا، جن میں یہ دُنیا بٹی ہے، تھوڑا تھوڑا حال تم کو لکھوں۔ تم نے انگلستان اور ہندستان کی تاریخ تھوڑی بہت پڑھی ہے۔ انگلستان تو خیر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، لیکن ہندستان جو ایک بہت بڑا مُلک ہے، وہ بھی دُنیا کا ایک چھوٹا ہی سا حصّہ ہے۔ اپنی اس دُنیا کی کہانی کے بارے میں اگر واقعی ہم کچھ جاننا چاہتے ہیں، تو یہی اتنا کافی نہیں ہے کہ بس اِس ایک چھوٹے سے مُلک کے بارے میں ہم جان لیں، جہاں ہم پیدا ہوئے ہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے

چھوٹا سا جملہ، ایک تصویر ہوتا تھا۔ مصر، کریٹ اور بابل میں بھی تصویر دار لکھائی کا رواج تھا۔ اسے 'اشاروں کی تحریر' کہتے ہیں، اور اس کے نمونے تم نے بعض کتابوں اور عجایب خانوں میں دیکھے بھی ہوں گے۔ مصر اور یورپ میں لکھائی کے یہ نمونے بہت پرانی عمارتوں میں ملتے ہیں۔ ان ملکوں میں بھی ایک مدت سے اس کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ لیکن چین میں آج بھی ایک قسم کی تصویر دار ہی لکھائی رایج ہے، جس کی لکھاوٹ اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہے، اور جو ہندی اور انگریزی کی اُس لکھاوٹ سے بالکل مختلف ہوتی ہے، جو داہنی طرف سے شروع ہو کر بائیں طرف جاتی ہے۔

ہندستان میں آج بھی شاید بہت سے پرانی عمارتیں مٹی اور بالو کے ڈھیر تلے دبی پڑی ہیں۔ جب تک ان کی کھدائی نہیں کی جائے گی، وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہیں گی، لیکن اتری ہندستان میں کچھ پرانے کھنڈر کھود کر نکالے بھی گئے ہیں۔ یہ بات تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ آریاؤں کے آنے سے پہلے دراوڑ نسل کے لوگ یہاں آباد تھے، اور ان کے پاس عمدہ تمدّن بھی تھا۔ دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ وہ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا مال عراق اور مصر جایا کرتا تھا۔ خاص کر چاول، گرم مسالہ، جیسے کالی مرچ اور عمارتیں بنانے کے لیے ساگوان کی لکڑی،

سمندری راستے سے وہ باہر بھیجا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عراق کے شہر اُر میں بعض محلات جنوبی ہندستان کے ساگوان کی لکڑی ہی سے بنائے گئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند سے مغرب کے ملکوں کو سونا، موتی، ہاتھی دانت، مور اور بندر بھیجے جاتے تھے۔ اس سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان بہت بیوپار ہوتا رہا ہوگا، اور یہ بات اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ لوگ تہذیب یافتہ ہوں۔

ہندستان اور چین دونوں ملکوں میں اس وقت چھوٹی چھوٹی ریاستیں یا سلطنتیں تھیں۔ اِن میں کوئی ملک بھی کسی ایک حکومت کے ماتحت نہیں تھا۔ ہر چھوٹا سا شہر، جس میں چند گاؤں اور کھیت ہوتے تھے، اس کی ایک الگ حکومت ہوتی تھی۔ اس طرح کی حکومتوں کو 'شہری حکومت' کہا جاتا ہے۔ اُس ابتدائی زمانے میں بھی، ان میں سے بعض شہروں کی حکومتیں جمہوری تھیں، جہاں کوئی بادشاہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے چنی ہوئی پنچایتیں سارا کام چلاتی تھیں۔ کچھ شہروں میں بادشاہت بھی تھی۔ یہ ساری شہری ریاستیں اگرچہ ایک دوسرے سے جدا ہوا کرتی تھیں، مگر کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بھی کام کرتی تھیں اور ایک دوسرے کی مدد کیا کرتی تھیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ کوئی بڑی شہری ریاست، بہت سی چھوٹی

چھوٹی شہری ریاستوں کی لیڈر بن جاتی۔

چین میں یہ شہری ریاستیں جلد ہی مل کر ایک بڑی سلطنت بن گئیں۔ اسی دور میں وہاں ایک بہت بڑی چہار دیواری — دیوار چین بنائی گئی۔ اس کے بارے میں تو تم پڑھ چکی ہو، کتنی عجیب چیز تھی یہ! سمندر کے کنارے سے لے کر چین کے اونچے اونچے جنوبی پہاڑوں تک یہ دیوار اس لیے بنائی گئی تھی کہ منگول نسل کے دوسرے قبیلے چین میں گھسنے نہ پائیں۔

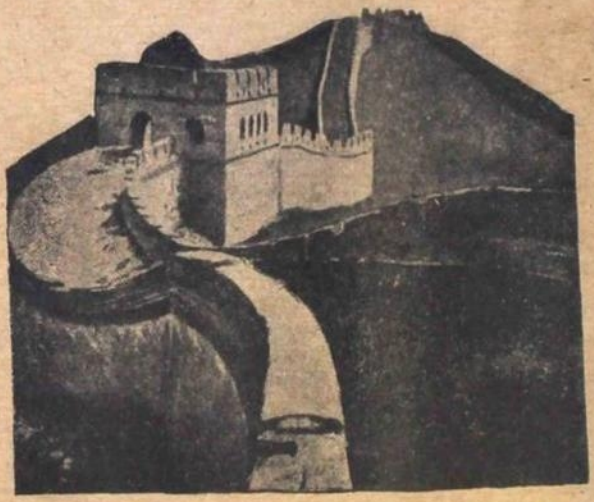

یہ دیوار ۱۴ سو میل لمبی، ۲۰ سے ۳۰ فٹ تک اونچی اور ۲۵ فٹ چوڑی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر، جگہ جگہ، قلعے اور برج بھی بنے تھے۔ اس طرح کی کوئی دیوار ہندستان میں بنائی گئی ہوتی تو شمال میں لاہور سے لے کر، جنوب میں مدراس تک چلی گئی ہوتی۔ یہ دیوار اب بھی موجود ہے، اگر تم چین جاؤ تو اسے دیکھ سکتی ہو۔

★

سمندری سفر اور تجارت

پرانے زمانے میں ایک اور دل چسپ قوم تھی، جسے فونی شین ([redacted]) کہتے تھے۔ یہ اسی نسل کی تھی، جو یہودیوں اور عربوں کی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر ایشیائے کوچک کے پچھمی ساحل پر آباد تھے، آج جسے ترکی کہتے ہیں۔ ان کے خاص شہر عکہ، صور اور صیدا۔ بحر روم کے کنارے تھے، اور یہ لوگ تجارت کے لیے دور دور تک لمبے سمندری سفر کرنے کے لیے مشہور تھے۔ بحر روم کے سارے مقامات کے علاوہ یہ لوگ سمندر ہی سمندر انگلستان تک چلے جاتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ہندستان بھی آئے ہوں۔

اب دو مزے دار بڑے کاموں کی شروعات ہمیں نظر آئے گی ـــــ تجارت کی اور سمندری سفر کی۔ دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے۔ اس وقت

ایسے اسٹیمر اور جہاز تو تھے نہیں، جیسے کہ آج تم دیکھتی ہو۔ ابتدائی زمانے کی کشتیاں تو بس درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر کے بنالی گئی ہوں گی۔ یہ کشتیاں پتوار سے چلائی جاتی تھیں، اور کبھی کبھی ان میں بادبان بھی لگالیے جاتے تھے، تاکہ ہوا کے زور سے وہ چل سکیں۔ ان دنوں سمندر کا سفر رہا ہوگا بہت دل چسپ اور ہیجانی۔ ذرا ایک چھوٹی سی کشتی کا تصور تو کرو، جو پتوار اور بادبان کے ساتھ بحرعرب کو پار کر رہی ہو! یہ کشتیاں اتنی چھوٹی رہی ہوں گی کہ ان میں چلنے پھرنے کے لیے بھی بہت کم جگہ ہوتی ہوگی۔ کبھی کبھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی ہچکولے دے کر انھیں زیر و زبر کر دیتا رہا ہوگا، اور اکثر تو وہ ڈوب بھی جاتی رہی ہوں گی۔ صرف جیالے ہی لوگ ان کشتیوں میں بیٹھ کر سمندر میں اُترتے رہے ہوں گے۔ یہ بڑے جوکھم کا سفر ہوتا تھا۔ مہینوں زمین کی صورت دیکھنے کو بھی نہ ملتی۔ کھانے پینے کا سامان اگر ختم ہوجاتا تو بیچ سمندر میں تو مل نہیں سکتا تھا، بس مچھلی یا چڑیا کے شکار ہی پر گزارا ممکن تھا۔ اُس زمانے کے سمندری سفر تھے بڑے مزے دار، مگر

پُرخطر بھی تھے۔ پُرانے وقتوں کے ملّاحوں کے بہت سے عجیب وغریب سمندری قصے مشہور ہیں۔

لیکن تمام خطروں کے باوجود لوگ سمندری سفر پر جاتے ہی تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ تو خطروں ہی کا لطف اٹھانے کے لیے نکلتے رہے ہوں، لیکن زیادہ لوگ تو سونے چاندی اور روپے پیسے کی لالچ ہی میں سفر کرتے تھے۔ وہ تو تجارت کی غرض سے جاتے تھے —— سامان بیچنے اور خریدنے کے لیے۔ اس طرح سے وہ روپیہ کماتے تھے۔

تجارت کیا ہے، اور یہ کیسے شروع ہوئی؟ آج بڑی بڑی دوکانیں تم دیکھتی ہو، اور کتنی آسانی سے ان دوکانوں میں جاکر جو کچھ چاہتی ہو، تم خرید لیتی ہو۔ لیکن کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو چیزیں تم خریدتی ہو، وہ آتی کہاں سے ہیں؟ الہ آباد کی کسی دوکان میں تم ایک اُونی شال خرید سکتی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ سارا راستہ طے کرکے وہ کشمیر سے آئی ہو، اور جو اُون اس میں لگا ہے، وہ کشمیر یا لداخ کے پہاڑوں کی بھیڑوں کی کمر کا اون ہو۔ ایک منجن جو تم خریدتی ہو، ممکن ہے کہ امریکا سے جہاز اور ریل کے ذریعے لایا گیا ہو۔ اسی طرح تم چین، یا جاپان، یا پیرس،

یا لندن کی بنی ہوئی چیزیں خریدتی ہو۔ اس کپڑے کے ٹکڑے کے بارے میں سوچو، جو باہر کے ملک سے آکر یہاں بازار میں بکتا ہے۔ روئی یہاں ہندستان میں پیدا ہوئی، وہ انگلستان بھیجی گئی، وہاں کسی بڑے کارخانے نے اس روئی کو خرید کر صاف کیا، اس سے سوت تیار کیا، اور پھر اس سے کپڑا بنایا۔ اس کے بعد وہی کپڑا ہندستان واپس آیا اور یہاں کے بازاروں میں فروخت ہوا۔ سوچو تو! کہ یہاں بکنے سے پہلے، انگلستان جانے اور واپس آنے میں، کتنے ہزار میل کی مسافت اس نے طے کی ہوگی! یہ تو عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ روئی تو یہاں پیدا ہو، اور کپڑا بنانے کے لیے وہ انگلستان تک لے جائی جائے اور وہ کپڑا پھر ہندستان واپس لایا جائے۔ یہ تو وقت، روپے اور محنت کا ضایع کرنا ہوا۔ ہندستان ہی میں روئی سے کپڑا تیار کیا جائے، وہ کہیں زیادہ سستا اور بہت اچھا ہوسکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہم لوگ بدیسی کپڑا خریدتے یا پہنتے نہیں ہیں۔ ہم کھدّر پہنتے ہیں، اس لیے کہ، جہاں تک ہوسکے، ہمارے اپنے ہی

ملک کی بنی ہوئی چیزیں خریدنا زیادہ سمجھ داری کی بات ہے۔ کھدر ہم اس لیے بھی خریدتے اور پہنتے ہیں کہ ان غریب لوگوں کی مدد بھی ہو جاتی ہے، جو اُسے کاتتے اور بُنتے ہیں۔

ہاں! تو تم سمجھ گئی ہوگی کہ تجارت کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ بڑے بڑے جہاز ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں ہمیشہ لے جایا کرتے ہیں۔ لیکن ہر زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا رہا ہے۔

بالکل ابتدائی زمانے میں جب انسان کسی جگہ بسنے لگے تھے، اس وقت تو تجارت بہت ہی کم ہوتی تھی۔ ہر چیز، جس کی انسان کو ضرورت ہوتی، وہ اُسے خود حاصل کرتا، یا خود ہی بناتا۔ اس وقت بہت چیزوں کی اُسے ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔ پھر، جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں، قبیلے کے لوگوں نے آپس میں کام بانٹ لیے۔ مختلف لوگ، مختلف کام کرنے اور طرح طرح کی چیزیں تیار کرنے لگے۔ اکثر یہ بھی ہوا ہوگا کہ ایک قبیلے کے پاس کوئی ایک چیز بہت زیادہ ہوگئی ہوگی، اور دوسرے قبیلے کے پاس کسی دوسری چیز کی افراط ہوگئی ہوگی۔ ان لوگوں

نے ، قدرتی طور پر، ان چیزوں کا آپس میں تبادلہ کیا ہوگا۔ مثلاً ایک قبیلے نے ایک گائے کے بدلے میں دوسرے قبیلے کو اناج کا ایک .بورا دے دیا ہوگا۔ ان دنوں میں روپیہ تو تھا نہیں۔ چیزوں کا بس تبادلہ ہی ممکن تھا۔ اس طرح سے لین دین شروع ہوا۔ لیکن یہ طریقہ رہا ہوگا بہت ٹیڑھا۔ ایک .بوری اناج لینے کے لیے ایک شخص کو گائے یا بھیڑ کا جوڑا لے جانا پڑتا ہوگا۔ مگر اس دشواری کے باوجود تجارت نے ترقی کی۔

سونا چاندی جب انسان کے ہاتھ آگیا، تو لوگوں نے اسے تجارت کے کام میں استعمال کرنا شروع کیا، اور پھر رفتہ رفتہ چیزوں کے بدلے میں سونا چاندی ہی دینے کا رواج ہوگیا۔ جس آدمی نے پہلے پہل یہ طریقہ سوچ کر نکالا ہوگا، وہ رہا ہوگا یقیناً بڑا عقل مند۔ سونے چاندی کے استعمال نے تجارت کو بہت آسان بنادیا۔ لیکن آج کی طرح اس وقت سکّے تو تھے نہیں۔ بس سونا تول کر دے دیا جاتا تھا۔ بہت مدّت کے بعد سکّوں کا دور آیا، اور اس سے تجارت اور زیادہ آسان ہوگئی۔ ہر آدمی کو

کہ دُنیا کے سارے مُلکوں کے بارے میں بھی ہم جانیں اور ان سب لوگوں سے واقف ہوں، جو یہاں بستے ہیں۔

مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے خطوں میں کچھ بہت زیادہ باتیں تم کو نہ بتا سکوں گا، لیکن مجھے اُمید ہے کہ یہ کم باتیں بھی تمھیں دل چسپ معلوم ہوں گی۔ اور ان کو پڑھ کر تمھارے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ ساری دُنیا ایک ہے، اور اس میں بسنے والی دوسری قوموں کے لوگ بھی ہمارے ہی بھائی بہن ہیں۔ جب تم بڑی ہوگی تو دُنیا اور اس کے بسنے والوں کی کہانی موٹی موٹی کتابوں میں پڑھوگی۔ اس وقت تمھیں اندازہ ہوگا کہ افسانے یا ناول جو تم نے پڑھے ہیں، یہ کہانی ان سے کہیں زیادہ دل چسپ ہے۔

یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ہماری زمین پُرانی، بہت پُرانی ہے —— کروڑوں سال پرانی![1] اور ایک مدّت دراز

۱۔ زمین کی عُمر کے بارے میں اب تک کوئی قطعی بات نہیں معلوم ہوسکی ہے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال تھا کہ ہماری زمین کی عمر دو کروڑ سے چار کروڑ سال ہے، لیکن حال ہی میں، ۱۹۵۳ء میں، کچھ امریکی سائنس دانوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ زمین ساڑھے چار ارب سال پُرانی ہے۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

سکّے کی قیمت معلوم ہوتی تھی، اس سے تولنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ آج سکّے ہر طرف رایج ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خود روپے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس سے تو بس اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے میں مدد ملتی ہے۔ چیزوں کا تبادلہ کرنے میں اس سے ہمیں آسانی ہوتی ہے۔ بادشاہ ریاس (Midas) کا قصہ تو تمھیں یاد ہوگا، جس کے پاس سونا تو بہت تھا، لیکن کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس لیے جب تک کسی چیز کے خریدنے کی ہمیں ضرورت نہ ہو، روپیہ بے مصرف ہے۔

اکثر دیہاتوں میں تو آج بھی تم دیکھوگی کہ لوگ چیزوں کا تبادلہ کرتے ہیں، روپے سے لین دین نہیں کرتے۔ لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، بلکہ روپے ہی سے کام لیا جاتا ہے، کیوں کہ یہ زیادہ آسان ہے۔ بہت سے بے وقوف لوگ سمجھتے ہیں کہ خود روپیہ ہی بہت اچھی چیز ہے، اس لیے اسے استعمال کرنے کی جگہ پر جمع کرتے ہیں، اور سینت کر رکھتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ روپیہ ہے کیا اور اس کا استعمال کیوں کر شروع ہوا۔

*

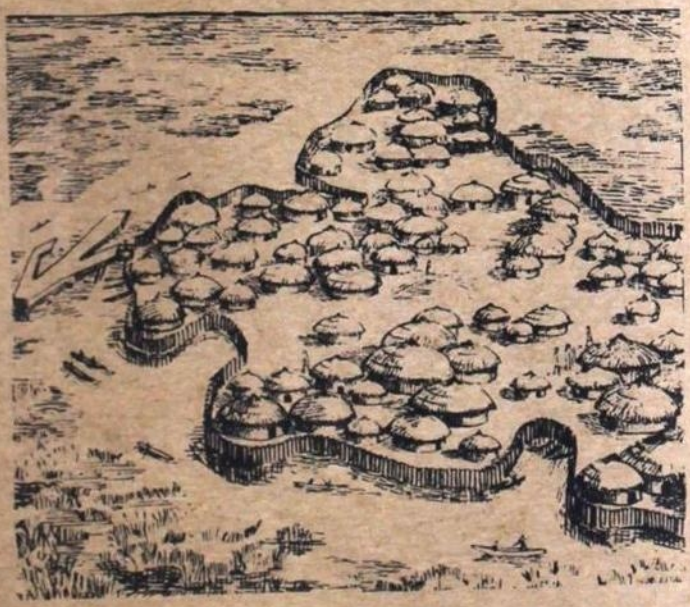

زبان، رسمِ خط اور گنتی

مختلف زبانوں اور ان کے باہمی رشتوں پر ہم پہلے ہی غور کر چکے ہیں۔ آؤ اب اس پر بھی غور کریں کہ زبان شروع کیسے ہوئی ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض جانور بھی کچھ الفاظ بول لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بندر بھی بعض سیدھی سادھی باتوں کے لیے ایک خاص قسم کی چیخ نکالتے ہیں یا بولی بولتے ہیں۔ تم یہ بھی دیکھتی ہو کہ جانور جب ڈر جاتے ہیں، اور اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، تو ایک خاص قسم کی آواز نکالتے ہیں۔

انسانوں میں بھی شاید بولی کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہوگی۔ شروع شروع میں تو یہ سیدھی سادھی چیخ ہی رہی ہوگی —— خوف کی اور خطرے سے آگاہ کرنے کی چیخ۔ اس کے بعد، ممکن ہے، کہ

اُس عرح کی آوازوں کی باری آئی ہو، جو مزدور کام کرتے وقت نکالتے ہیں۔ بہت سے لوگ جب مل کر کوئی کام کرتے ہیں، تو وہ سب مل کر ایک خاص قسم کا شور بھی کرتے ہیں۔ تم نے بہت سے لوگوں کو مل کر کسی چیز کو کھینچتے، یا کسی بھاری بوجھ کو اٹھاتے دیکھا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ سب کے مل کر چلّانے سے ان کا کام کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ مزدوروں کی یہی آوازیں، ممکن ہے کہ پہلی انسانی بولیاں رہی ہوں۔

پھر اور سیدھے سادھے الفاظ آئے ہوں گے، جیسے پانی، آگ، گھوڑا، بھالو۔ یہ سب نام (اسم) ہی رہے ہوں گے شاید، فعل کا ایک بھی لفظ نہ رہا ہو۔ کوئی آدمی اگر یہ کہنا چاہتا رہا ہوگا کہ اس نے بھالو دیکھا ہے، تو ایک بچے کی طرح "بھالو" کہہ کر وہ اس کی طرف اشارہ کرتا رہا ہوگا۔ اس وقت زیادہ بات چیت نہ ہوتی ہوگی۔

بولی نے ترقی کی۔ چھوٹے چھوٹے پھر بڑے بڑے فقرے بولے جانے لگے۔ ایک ہی وقت میں تمام مختلف قبیلوں کے لیے کبھی بھی شاید ایک ہی

زبان نہ رہی ہوگی۔ لیکن کسی وقت بھی بہت سی مختلف زبانیں بھی نہ رہی ہوں گی۔ یہ تو میں تمھیں بتلا چکا ہوں کہ اس زمانے میں کچھ زبانیں پیدا ہوئی تھیں، جن سے زبانوں کے بڑے بڑے گھرانے وجود میں آئے۔

تمدّن کے ابتدائی دور میں، جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں، زبانیں بہت کچھ ترقی کر چکی تھیں۔ بہت سے گیت بن چکے تھے، جنھیں بھاٹ اور گوئیے گاتے پھرتے تھے۔ اس زمانے میں لکھائی یا کتابوں کا رواج تو تھا نہیں، اس لیے لوگوں کو بہت سی باتیں زبانی یاد کرنی پڑتی تھیں۔ گیتوں اور نظموں کا یاد کر لینا چوں کہ آسان ہوتا ہے، اس لیے ان تمام ملکوں میں جہاں تمدن موجود تھا، شعر شاعری بہت مقبول تھی۔

بھاٹوں اور گویّوں کو گزرے ہوئے بہادروں کے کارناموں کے گیت گانے کا عام طور پر بہت شوق تھا۔ ان دنوں میں لوگوں کو چوں کہ جنگ سے بہت دل چسپی تھی، اس لیے ان گیتوں میں، میدان جنگ کی بہادریوں ہی کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ اس طرح کے گیت ہندستان میں، اور دنیا کے دوسرے

ابتدائی دور کی تصویری تحریروں کے نمونے

ملکوں میں بھی، ملتے ہیں۔

لکھائی کی ابتدا بھی بڑے دل چسپ طریقے سے ہوئی۔ چینی لکھاوٹ کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ تمام لکھاوٹیں تصویروں ہی سے شروع ہوئی ہوں گی۔ کوئی آدمی اگر مور کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا رہا ہوگا، تو اس نے بس مور کی تصویر بنا دی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے کچھ زیادہ لکھائی تو ہو نہیں سکتی تھی، اس لیے تصویریں رفتہ رفتہ آسان سے آسان تر ہوتی گئی ہوں گی۔ پھر، بہت زمانہ گزرنے کے بعد، حرف ایجاد کیے گئے ہوں گے اور انھیں ترقی دی گئی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی لکھائی زیادہ آسان اور ترقی کی رفتار تیز ہوگئی ہوگی۔

ہندسوں کا جان لینا اور گنتی کا آجانا، انسان کی بہت بڑی دریافت تھی۔ ہندسوں کے جانے بغیر بیوپار چلانے کا تو تصور ہی مشکل ہے۔ ہندسوں کا ایجاد کرنے والا رہا ہوگا بڑا ہی عقل مند آدمی۔ یورپ میں جو ہندسے، ابتدائی دور میں رایج تھے، وہ بڑے بدنما ہوتے تھے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ جو رومن ہندسے کہلاتے ہیں، کیسے ہوتے ہیں I, II, III, IV, V, VI, VII, VIII, IX, X

وغیرہ وغیرہ۔ یہ بڑے بھدّے اور لکھنے میں مشکل ہوتے ہیں۔ آج کل جو ہندسے، تمام زبانوں میں ہم استعمال کرتے ہیں، وہ ان کے مقابلے میں بہت اچھے ہیں۔ میرا مطلب 1, 2, 3, 4, 5, 6, 7, 8, 9, 10 سے ہے۔ یہ عربی ہندسے کہلاتے ہیں، کیوں کہ یورپ والوں نے یہ عربوں ہی سے سیکھے تھے۔ لیکن خود عربوں نے یہ ہندسے ہندستان سے سیکھے تھے، اس لیے انھیں ہندستانی ہندسے کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

لیکن میری رفتار بہت تیز ہوتی جارہی ہے۔ ابھی عربوں تک تو ہم آئے بھی نہیں ہیں۔

★

قونی سِتین لکھائی کا ایک نمونہ

لوگوں کے مختلف طبقے

بچے اور بچیوں کو، بلکہ جوانوں کو بھی، تاریخ اکثر عجیب طریقے سے پڑھائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو بادشاہوں اور دوسرے لوگوں کے نام اور جنگ وغیرہ کی تاریخیں یاد کرائی جاتی ہیں۔ لیکن تاریخ یقیناً لڑائیوں کے ذکر اور ان چند لوگوں کے ناموں میں نہیں رکھی ہے، جو بادشاہ یا سپہ سالار بن گئے تھے۔ تاریخ کا کام تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر ملک کے لوگوں کے بارے میں یہ بتلائے کہ وہ کس طرح رہتے تھے، کیا کرتے تھے اور وہ کیا سوچتے تھے۔ تاریخ سے لوگوں کی شادمانیوں اور ان کی پریشانیوں کا، یا ان کی مشکلات کا اور ان مشکلات پر قابو پانے کا حال معلوم ہونا چاہیے۔ اس انداز سے اگر ہم تاریخ پڑھیں، تو اس سے بہت کچھ سیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس سے ایک فایدہ یہ بھی

تک اس پر مرد یا عورتیں نہیں تھیں۔ انسانوں سے پہلے یہاں صرف جانور ہی تھے، اور جانوروں سے بھی پہلے ایک ایسا زمانہ تھا جب کوئی جان دار چیز یہاں تھی ہی نہیں۔ آج ہماری دُنیا انسانوں اور طرح طرح کے جانوروں سے اس طرح بھری ہے کہ یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ کبھی یہ ان سے بالکل خالی بھی رہی ہوگی۔ لیکن سائنس دان اور دوسرے پڑھے لکھے لوگ جنھوں نے اس کا مُطالعہ کیا ہے اور ان مسایل پر غور کیا ہے، بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں ہماری زمین اتنی گرم تھی کہ اس پر کسی جان دار کا زندہ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم اگر ان کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں، اور چٹانوں اور اس زمانے کے جانوروں کے آثار کو دیکھیں، جنھیں فاسل[1] کہتے ہیں، تو ہم خود اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ واقعی ایسا ہی ہوگا۔

تم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتی ہو، لیکن اس پُرانے زمانے میں جب انسان تھے ہی نہیں تو کتابیں کون

۱۔ فاسل (Fossil) : جانوروں کی ہڈیاں یا درختوں کے حصے جو زمین کے نیچے دبے دبے پتھر بن گئے ہیں یا جو خود تو سڑ گل کر ختم ہوگئے لیکن پتھروں میں اپنے نقش چھوڑ گئے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اُس طرح کی دشواریاں اگر ہمیں پیش آئیں، جو اوروں کو پیش آچکی ہیں، تو تاریخ پڑھنے کے بعد ان پر قابو حاصل کرنے کا ڈھنگ بھی ہم سیکھ سکتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی تاریخ پڑھ کر یہ بات ہم خاص طور سے معلوم کر سکتے ہیں کہ لوگوں کی حالت بہتر ہوتی رہی ہے، یا بدتر ہوتی گئی ہے، اور کچھ ترقی بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگلے وقتوں میں جو بڑے بڑے مرد اور بڑی بڑی عورتیں گزری ہیں، ان کی زندگی سے ہمیں یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور سیکھنا چاہیے۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگلے وقتوں میں مختلف قسم کے لوگوں کی حالت کیسی تھی۔

میں نے تمھیں بہت خط لکھے ہیں، اور یہ اس سلسلے کا چوبیسواں خط ہے۔ لیکن اِس وقت تک ہم بہت پرانے زمانے کی باتیں کرتے رہے ہیں، جس کے بارے میں ہمیں بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ ہم چاہیں تو اس زمانے کو تاریخ کے آغاز کا، یا تاریخ کی صبحِ صادق کا نام دے سکتے ہیں۔ اب جلد ہی اس کے بعد کے زمانے کی ہم باتیں کریں گے، جسے

تاریخ کا دور کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اگلے زمانے کے تمدّن کا ذکر ختم کرنے سے پہلے آؤ ایک بار پھر ہم اس پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ اس زمانے میں لوگ کس قسم کے ہوا کرتے تھے۔

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں قبیلوں کے لوگوں نے کس طرح مختلف قسم کے کام شروع کیے تھے۔ انھوں نے کام کی، یا محنت کی تقسیم کرلی تھی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ شیخ نے اپنے خاندان کو کس طرح اور لوگوں سے الگ کرلیا، اور وہ صرف انتظامی کام ہی کیا کرتا تھا۔ وہ کچھ اعلا قسم کا انسان بن گیا۔ یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ کا خاندان اور لوگوں سے مختلف ہوگیا۔ اس طرح سے لوگوں کے دو طبقے بن گئے۔ ایک تو وہ جو صرف انتظام کرتا اور حکم صادر کیا کرتا، اور دوسرا وہ جو واقعی کام کرتا۔ وہ طبقہ جس کے حصے میں انتظامی کام آتے، اس کے ہاتھ میں اقتدار بھی زیادہ ہوتا، اور اس سے فایدہ اٹھاکر وہ زیادہ سے زیادہ چیزیں حاصل کرلیتا۔ محنت کرنے والوں سے وہ زیادہ سے زیادہ وصول کرکے۔ دوسرے کے مقابلے میں وہ دولت مند بن گیا۔

ہاں تو محنت کی تقسیم کے ساتھ ساتھ مختلف طبقے بھی وجود میں آگئے۔ بادشاہ، بادشاہ کا خاندان، اور اس کے درباری ہوتے۔ یہ لوگ بس ملکی انتظام اور ملک کے لیے جنگ کرتے، اور عام طور پر کوئی اور کام نہ کرتے۔

دوسرے درجے پر مندروں کے پروہت اور مندروں سے تعلق رکھنے والے اور لوگ ہوتے۔ ان دنوں میں یہ بڑے اہم لوگ ہوا کرتے تھے۔ ان کے کام کے متعلق ہم آگے چل کر باتیں کریں گے۔

تیسرا طبقہ تاجروں کا تھا۔ یہ لوگ تجارت کا سامان ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جاتے، خرید و فروخت کرتے، اور دوکانیں کھولتے۔

چوتھا دست کاروں کا طبقہ تھا۔ یعنی وہ لوگ جو طرح طرح کی چیزیں بناتے — سوت کاتتے، کپڑا بنتے، مٹی کے برتن، پیتل کا سامان، سونے اور ہاتھی دانت کی چیزیں اور بہت کچھ بناتے۔ زیادہ تر دست کار شہروں میں یا اس کے قریب رہتے تھے۔ لیکن گاؤں میں بھی دست کار پائے جاتے تھے۔

ایک طبقہ کسانوں اور مزدوروں کا بھی تھا، جو کھیتوں میں اور شہروں میں کام کیا کرتے تھے۔ یقیناً یہی سب سے بڑا طبقہ تھا، اور اسی سے دوسرے تمام طبقے کچھ نہ کچھ چھین جھپٹ لینا چاہتے تھے۔

بادشاہ، مندر اور پُروہِت

پچھلے خط میں ہم نے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پانچ مختلف طبقے بن گئے تھے۔ سب سے بڑا طبقہ کسانوں اور مزدوروں کا تھا۔ کسان کھیتی باڑی کرکے غلہ پیدا کرتے۔ یہ کام وہ اگر نہ کرتے، اور کوئی اور بھی جوتنے بونے کا کام نہ کرتا، تو کھانے پینے کی چیزیں پیدا ہی نہ ہوتیں، اور ہوتیں بھی تو بہت کم۔ اس لیے کسان ہی سب سے زیادہ اہم تھے۔ وہ نہ ہوتے تو سب بھوکوں مرجاتے۔ مزدور بھی کھیتوں پر اور شہروں میں مفید کام کرتے تھے۔ اتنے اہم کام کرنے اور لوگوں کے لیے اتنے ضروری ہونے کے باوجود، مزدوروں اور کسانوں کو اپنی محنت کے مقابلے میں بہت کم ملتا۔ جو کچھ وہ پیدا کرتے، اس کا بہت کچھ حصہ دوسروں کو، خصوصاً بادشاہ کو، اس کے طبقے کے دوسرے لوگوں کو اور اس کے امیروں کو مل جاتا۔

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بادشاہ اور اس طبقے کے لوگوں کو بہت کچھ اختیارات حاصل تھے۔ ابتدائی دور کی قبایلی زندگی میں زمین، کسی ایک فرد کی نہیں، بلکہ پورے قبیلے کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ لیکن شاہی طبقے کے لوگوں کا اقتدار جوں جوں بڑھا، وہ کہنے لگے کہ زمین ان کی ہے۔ وہ سب زمین دار بن گئے، اور کسان، جو حقیقتاً محنت کے سارے کام کیا کرتے تھے، وہ بس ان کے ایک طرح کے نوکر بن گئے۔ کاشت کار زمین سے جو کچھ پیدا کرتے، وہ بٹ جاتا، اور اس کا بڑا حصہ زمین دار کو مل جاتا۔

بعض مندروں کے پاس بھی اراضی تھی، اور اس اعتبار سے وہ مندر بھی زمین دار بن گئے تھے۔ آؤ دیکھیں کہ یہ مندر اور ان کے پروہت کیا تھے۔ میں اپنے کسی خط میں یہ تمھیں بتا چکا ہوں کہ ابتدائی دور کے وحشی انسانوں نے دیوتاؤں اور مذہب کے بارے میں اس لیے سوچنا شروع کیا تھا کہ بہت سی باتیں ان کی سمجھ ہی میں نہ آتی تھیں، اور جو باتیں وہ نہ سمجھتے، ان سے ڈرنے لگتے۔ انھوں نے ہر بات کے لیے ایک دیوتا یا دیوی بنالیا تھا — دریا، پہاڑ،

سورج، درخت، جانور اور ایسی چیزیں، جو وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، بس ان کے بارے میں سوچ ہی سکتے تھے ــ جیسے بھوت پریت، سب ان کے دیوی دیوتا تھے۔ چوں کہ ان پر خوف طاری رہتا تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان کے دیوتا انھیں سزا دینا چاہتے ہیں۔ ان کے دیوتا بھی، ان ہی کی طرح سخت گیر اور ظالم تھے، اور لوگ قربانیاں کرکے انھیں منانے اور خوش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

ان دیوی دیوتاؤں کے لیے مندر کھڑے ہو گئے۔ ہر مندر میں ایک خاص کمرہ ہوتا، جسے منڈپ یا مقدس مقام کہا جاتا، اور وہاں اس دیوتا کا بُت رکھا جاتا، جسے وہ پوجتے تھے۔ وہ کسی ایسی چیز کی پرستش نہیں کرسکتے تھے، جسے وہ آنکھ سے دیکھ نہ سکیں۔ کسی اَن دیکھی چیز کی پرستش ہے بھی کچھ مشکل بات۔ تم جانتی ہو کہ ایک چھوٹا بچہ صرف اسی چیز کے بارے میں سوچ سکتا ہے، جسے وہ دیکھتا ہے۔ ابتدائی دور کے آدمی بھی کچھ بچوں ہی جیسے تھے۔ چوں کہ بُتوں کی موجودگی کے بغیر وہ پرستش نہیں کرسکتے تھے، اسی لیے مندروں میں وہ بت رکھ لیا کرتے تھے۔ یہ عجیب سی

بات ہے کہ یہ بُت ہیبت ناک حد تک بدصورت ہوا کرتے تھے۔ ان کی شکل کبھی جانوروں کی سی ہوتی اور کبھی ان کا آدھا حصہ انسان کا اور آدھا جانور کا ہوتا۔ مصر میں ایک وقت میں بلّی کی پرستش ہوتی تھی، اور ایک دوسرے زمانے میں شاید بندر کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لوگ جانوروں کے بدنما بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں۔ بت پوجنا ہی ہے تو خوب صورت بت کیوں نہ بنائے جائیں؟ لیکن شاید خیال یہ کیا جاتا تھا کہ دیوتا کوئی ایسی چیز ہے، جس سے ڈرنا چاہیے؟ اسی لیے ان کے بت بھی بھیانک بنائے جاتے تھے۔

اس زمانے میں لوگ ایک خدا، یا ایک عظیم طاقت، کا تصور نہیں کر سکتے تھے، جس طرح سے آج بیش تر لوگ کرتے ہیں۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ بہت سے دیوی دیوتا ہیں، جو کبھی کبھی آپس میں لڑتے بھڑتے بھی ہیں۔ مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں مختلف دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔

مندر پروہتوں اور پروہتنیوں سے بھرے رہتے تھے۔ یہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اور دوسروں کے

مقابلے میں زیادہ پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ اس لیے وہ بادشاہوں کے مشیر بن گئے۔ ان دنوں میں پروہت ہی کتابیں لکھتے اور نقل کرتے تھے۔ ان کے پاس چوں کہ کچھ علم بھی ہوتا تھا، اس لیے عقل مند اور تجربے کار سمجھے جاتے تھے۔ وہ طبیب بھی ہوا کرتے تھے۔ اور یہ دکھلانے کے لیے کہ وہ کتنے ہوشیار ہیں، کبھی کبھی لوگوں کو کرتب بھی دکھایا کرتے تھے۔ لوگ چوں کہ سیدھے سادھے اور ناواقف ہوتے تھے، اس لیے پروہتوں کو جادوگر سمجھ کر ان سے ڈرتے تھے۔

پروہت عوام کی زندگی میں ہر طرح سے شامل رہتے، وہ چوں کہ بڑے دانا سمجھے جاتے تھے، اس لیے لوگ جب کسی مصیبت میں پھنستے، یا بیمار ہوتے، تو ان ہی کے پاس جاتے۔ وہی ان کے لیے بڑے بڑے تہواروں کی تاریخیں مقرر کرتے۔ ان دنوں میں کوئی جنتری تو تھی نہیں، خاص کر عام لوگوں کے واسطے۔ اس لیے تہواروں ہی سے تاریخوں کا حساب لگایا جاتا۔

ہوسکتا ہے کہ جب لوگ شہروں میں پہلے پہل آباد ہوئے ہوں گے، تو بعض جگہ بادشاہ نہیں، بلکہ پروہت ہی ان پر حکومت کرتے رہے ہوں گے۔

اس کے بعد بادشاہ نمودار ہوا ہوگا اور اس نے پروہتوں کی جگہ لے لی ہوگی، کیوں کہ وہ ان سے بہتر لڑ سکتا تھا۔ اکثر جگہوں پر بادشاہ ہی پروہت بھی ہوتا تھا۔ جیسے مصر میں فرعون تھے۔ فرعون اپنی زندگی میں بھی آدھے دیوتا سمجھے جاتے تھے، اور مرنے کے بعد تو ان کی پوجا ہوتی تھی۔

ایک فرعون کا مجسمہ

گزشتہ پر ایک نظر

میرے خطوں کو پڑھتے پڑھتے کیا تم اکتا نہیں گئی ہو؟ میں بھی سمجھتا ہوں کہ تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔ اب کچھ دنوں تک میں کوئی نئی بات تمھیں نہ لکھوں گا۔ ہاں! میں یہ ضرور چاہوں گا کہ ہم جو کچھ کر چکے ہیں، بس تم اسی پر غور کرو۔ چند خطوں میں لکھوکھا برس کی داستان ہم نے دُھرا ڈالی ہے۔ یہ قصہ ہم نے اس وقت سے شروع کیا تھا جب زمین سورج کا ایک حصہ تھی۔ ہم نے دیکھا کہ سورج سے الگ ہوکر وہ کس طرح رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوئی۔ پھر لکھوکھا برس میں آہستہ آہستہ اس پر زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ تمھیں بھلا اس کا بھی اندازہ ہے کہ ایک ملین — دس لاکھ برس کا زمانہ کتنا ہوتا ہے؟ لکھوکھا برس کی مدّت کا اندازہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ تم دس ہی برس کی ہو، لیکن کتنی بڑی سی ہوگئی ہو۔ اب تم چھوٹی سی بچّی

قدرت کی کتاب کا ایک ورق ـــــ ایک درخت کا فاسل

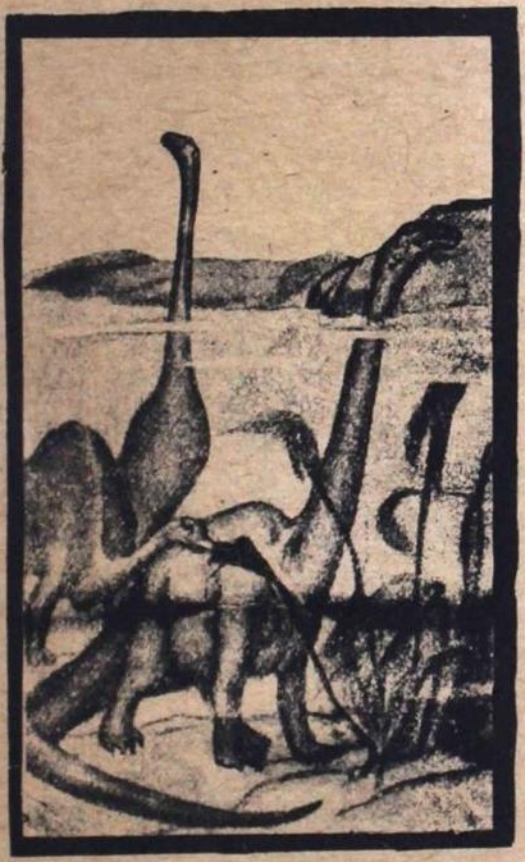

نہیں، نوجوان خاتون ہو۔ تمھارے لیے سو برس کا زمانہ ایک طویل مدّت ہے، لیکن ہزار یا دس لاکھ برس کا زمانہ ــ سوچو تو کتنی طویل مدت ہوئی یہ! مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے چھوٹے سے ذہن میں اس کا تصور شاید ہی سما سکے۔ ہم اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم جزبز اور پریشان ہوجاتے ہیں۔ مگر دنیا کی طویل تاریخ میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھلا کیا حقیقت ہے؟ تاریخ کے طویل زمانوں کا حال پڑھنا ہمارے لیے مفید اور سبق آموز ہوسکتا ہے، کیوں کہ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہم زیادہ پریشان نہ ہوں گے۔ آؤ، اس بے حد طویل زمانے کا ہم خیال کریں جب زندگی کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔ پھر وہ زمانہ یاد کریں جب سمندر میں جانور ہی تھے۔ زمین پر کسی جگہ انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس کے بعد جانور پیدا ہوئے اور لکھوکھا سال تک آزادی کے ساتھ زمین پر دندناتے پھرتے رہے، اور انھیں شکار کرنے یا مارنے والا کوئی آدمی بھی نہ تھا۔ پھر جب آدمی پیدا ہوا، تو کتنا حقیر، ننھی، چھوٹا سا، اور سب حیوانوں میں کم زور ترین تھا، لیکن ہزاروں برس

کے عرصے میں وہ رفتہ رفتہ مضبوط تر اور ہوشیار تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ زمین پر جتنے بھی حیوان ہیں، وہ ان سب کا آقا بن گیا، اور سب حیوان اس کی فرماں برداری کے لیے، اس کے نوکر اور غلام بن گئے۔

پھر تمدّن کی ترقی کے دور کی طرف ہم آتے ہیں۔ اس کا بالکل ابتدائی زمانہ بھی ہم نے دیکھا ہے۔ آگے چل کر ہم اس کے بعد کا زمانہ دیکھیں گے۔ اب ہمیں لاکھوں برس کی مدت طے نہیں کرنی ہے۔ اپنے خطوں میں ہم اس زمانے تک پہنچ چکے ہیں، جو اب سے صرف چار پانچ ہزار برس پہلے تھا۔ ان چار ہزار برسوں کے بارے میں ہم اس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں، جتنا کہ لکھوکھا برس پہلے کے زمانے کے بارے میں ہمیں معلوم ہے۔ ان ہی چار ہزار برسوں میں تاریخ نے اور انسانی نشوونما نے حقیقی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ تم بڑی ہوگی تو اس ترقی کے بارے میں بہت کچھ پڑھوگی۔ اس کے بارے میں چند ہی باتیں میں تمھیں لکھوں گا تاکہ تمھیں اس کا کچھ اندازہ ہوسکے کہ ہماری اس مختصر سی دنیا میں آدمی کی زندگی کیسی گزری ہے۔

★

فاسِل اور کھنڈر

بہت دنوں سے میں نے کوئی خط تمھیں نہیں لکھا ہے۔ پچھلے دو خطوں میں اُن گزرے ہوئے زمانوں پر ہم نے دوبارہ نظر ڈالی تھی، جن کا حال پچھلے خطوں میں میں نے لکھا تھا۔ تصویروں کے کچھ پوسٹ کارڈ بھی میں نے تمھیں بھیجے ہیں۔ جن میں مچھلیوں کے فاسل کی تصویریں بھی ہیں۔ ان سے تمھیں اندازہ ہوا ہوگا کہ فاسل کسے کہتے ہیں۔ مسوری میں جب ہم تم ملے تھے تو کچھ اور فاسل کی تصویریں بھی میں نے تمھیں دکھائی تھیں۔

ایک مچھلی کا فاسل

ایک حیوان کا فاسل تمھیں خاص طور سے یاد ہوگا جو ہمارے آج کے سانپ، گرگٹ، گھڑیال اور کچھوے کی طرح رینگ کر چلتا تھا۔ پرانے زمانے کے رینگنے والے حیوانوں کا تعلق بھی ان ہی جانوروں کے خاندان سے تھا۔ لیکن وہ ان سے بہت بڑے اور ان سے بہت مختلف ہوتے تھے۔

ساؤتھ کن سنگٹن میوزیم کے وہ بڑے بڑے حیوان تو تمھیں یاد ہی ہوں گے، جو ہم نے وہاں دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک تو تیس یا چالیس گز لمبا تھا۔ ایک قسم کا مینڈھک بھی وہاں تھا، جو آدمی سے بھی بڑا تھا، اور اتنا ہی بڑا ایک کچھوا بھی تھا۔ بڑے بڑے چمگادڑ اِدھر اُدھر اُڑا کرتے تھے۔ ایک جانور تھا، جو کھڑا ہوتا تو چھوٹے سے درخت کے برابر معلوم ہوتا۔

پرانے پودوں کے فاسل کبھی تم نے وہاں دیکھے تھے۔ ایک چٹان پر پتوں اور کھجور کے درخت کے خوب صورت نقش بھی تھے۔

رینگنے والے جانوروں کی آمد کے بہت دنوں کے بعد دودھ دینے والے جانور آئے وہ جانور جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد آج جو جانور ملتے ہیں، اُن میں سے بیش تر، اور خود ہم سب بھی تو، دودھ پلانے والے ہی ہیں۔ پرانے زمانے کے دودھ دینے والے جانور، ہمارے آج کے جانوروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ ان میں اکثر بہت لمبے چوڑے بھی ہوتے تھے مگر، رینگنے والے جانوروں کے برابر ان کا قد نہیں ہوتا تھا۔ لمبے لمبے دانتوں والے بھاری بھرکم ہاتھی اور بڑے بڑے بھالو بھی ہوتے تھے۔

تم نے آدمیوں کے فاسل بھی دیکھے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ دل چسپ نہیں تھے، کیوں کہ سوا ہڈی اور کھوپڑی کے ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔

مصری اہراموں اور ممیوں کی کچھ عمدہ تصویریں بھی میں نے تمھیں دکھائی تھیں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ان میں سے بعض بہت خوب صورت تھیں، لکڑی کے تابوتوں پر وہاں کے لوگوں کے لمبے چوڑے قصوں کی رنگین تصویریں بھی بنی تھیں۔ تھبس کے مصری اہراموں کی دیواروں پر جو تصویریں بنائی گئی تھیں وہ خصوصیت

ایک ممی کی تصویر

سے بہت دل چسپ تھیں۔
مصر کے شہر تھبس
کے مندروں اور محلوں
کے کھنڈر کی تصویریں
بھی تم نے دیکھیں تھیں۔
عالی شان ستونوں کی
یہ بڑی بڑی عمارتیں
رہی ہوں گی۔ تھبس ہی
کے قریب میمون کا ایک
دیو پیکر مجسمہ بھی ہے۔

تھبس کے
دو مندروں
کے کھنڈر

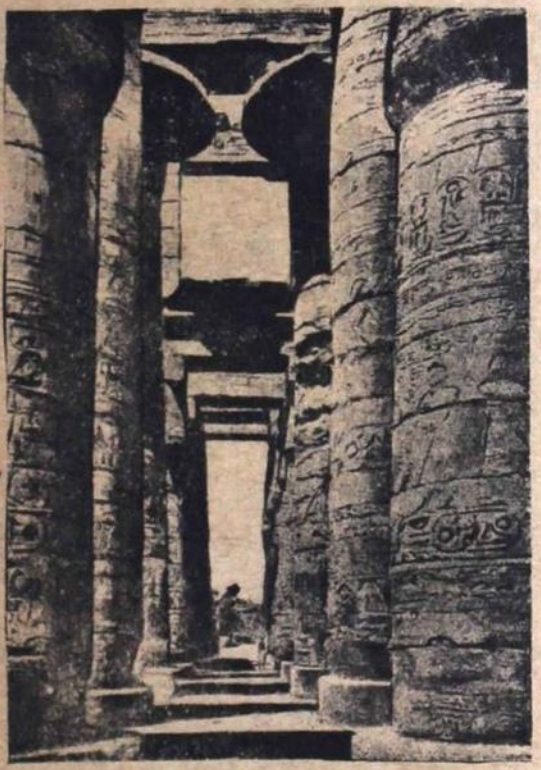

کارنک کے ایک مندر کا کھنڈر

بالائی مصر کے شہر کارنک کے مندروں اور عمارتوں کے کھنڈروں کی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں ہی کو دیکھ کر تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ مصری لوگ کتنے اچھے معمار رہے ہوں گے۔ انجینیرنگ کی بہت سی باتیں جب تک انھیں نہ معلوم رہی ہوں، یہ بڑے بڑے محل اور مندر وہ بنا ہی نہیں سکتے تھے۔

پچھلے زمانے پر ہم دوبارہ ایک نظر ڈال چکے ہیں۔ اگلے خط سے ہم آگے کی طرف بڑھیں گے۔

ہندستان میں آریاؤں کی آمد

ہم نے اب تک پرانے، بہت پرانے، زمانے کی باتیں کی ہیں۔ اب ہم دیکھیں گے کہ انسان نے کیوں کر ترقی کی اور اُس نے کیا کارنامے انجام دیئے۔ پرانے زمانے کی ساری باتیں، قبلِ تاریخ کی باتیں کہی جاتی ہیں، کیوں کہ اُس دور کی کوئی اصلی تاریخ ہمارے پاس نہیں ہے۔ صرف اپنے قیاس ہی سے ہمیں بہت کچھ کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن اب ہم لوگ اس جگہ پہنچ چکے ہیں، جہاں سے تاریخ کا سِرا ملتا ہے۔

آؤ، سب سے پہلے دیکھیں کہ خود ہندستان میں کیا کیا ہوا۔ یہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ بہت پرانے زمانے میں، مصر کی طرح، ہندستان میں بھی تمدن موجود تھا۔ تجارت ہوتی تھی اور ہندستانی جہاز مصر، عراق، اور دوسرے ملکوں کو سامان تجارت لے جایا کرتے تھے۔ اس دور میں جو لوگ ہندستان میں رہتے تھے،

لکھتا! پھر ہمیں اس زمانے کی باتیں معلوم کیسے ہوں؟ بیٹھ کر عقلی گدّے لگانے سے تو کام نہیں چلتا۔ اس طرح اگر کام چل سکتا تو بڑا مزا آتا۔ پھر تو جو بات ہم جاننا چاہتے اسے سوچ لیتے اور پریوں کی مزے دار کہانیوں کی طرح گڑھ لیتے۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ یہ من گڑھت باتیں سچ بھی ہوتیں، کیوں کہ یہ آنکھوں دیکھی تو نہ ہوتیں۔ یہ سچ ہے کہ اس پُرانے زمانے کی لکھی ہوئی کتابیں تو ہمارے پاس نہیں ہیں، لیکن خوش قسمتی سے کچھ ایسی چیزیں ضرور باقی ہیں جو ہمیں اس زمانے کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہیں اور اتنی ہی اچھی طرح جیسے ہم کسی کتاب میں پڑھتے۔ یہ ہیں چٹانیں، پہاڑ، سمندر، ستارے، دریا، ریگستان اور پُرانے زمانے کے جانوروں کے فاسل۔ یہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں زمین کے ابتدائی دَور کی کہانی کے لیے کتابوں ہی کا کام دیتی ہیں۔ اس کہانی کو سمجھنے کا اصلی طریقہ یہ نہیں ہے کہ دوسروں کی لکھی ہوئی کتابیں ہی ہم پڑھیں، بلکہ خود قدرت کی عظیم کتاب کا بھی ہمیں مُطالعہ کرنا چاہیے۔ مجھے اُمید ہے کہ چٹانوں اور پہاڑوں کو دیکھ کر اس کہانی کے پڑھنے کا ڈھنگ تم جلد ہی سیکھ لوگی۔ ذرا سوچو تو یہ کتنا دل چسپ مشغلہ ہے۔ ہر چھوٹا سا پتھر جو تم سڑک پر

انھیں دَرَاوَڑ کہا جاتا ہے۔ ان ہی لوگوں کی اولادیں جنوبی ہند اور مدراس کے ارد گرد رہتی ہیں۔

ان دراوڑوں پر، شمال کی طرف سے، آریوں نے حملہ کر دیا۔ وسطی ایشیا میں آریوں کی تعداد بہت زیادہ اور کھانے کا سامان بہت کم رہا ہوگا۔ اسی سے وہ لوگ دوسرے ملکوں میں پھیلنے لگے۔ بہت سے ایران گئے اور بہت سے تو مغرب میں یونان تک پہنچ گئے۔ کشمیر کے قریب پہاڑوں کو پار کر کے ان کے جھنڈ کے جھنڈ ہندستان بھی آئے۔

آریائی بہت مضبوط اور جنگ جو قوم تھی۔ اس نے دراوڑوں کو مار بھگایا۔ شمال مغرب کی طرف آریوں کے گروہ در گروہ ہندستان آئے ہوں گے۔ دراوڑوں نے پہلے تو ان کا بڑھنا روک دیا، لیکن جب وہ بہت بڑی تعداد میں آئے، تو انھیں روکنا ممکن نہیں رہا۔ بہت دنوں تک آریا صرف شمال ہی میں، افغانستان اور پنجاب تک محدود رہے۔ پھر وہ لوگ اتر پردیش تک آگئے، جہاں ہم لوگ رہتے ہیں۔ وہ لوگ پھیلتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ وسطی ہند میں وندھیاچل کے پہاڑوں تک جا پہنچے، جہاں بہت

گھنے جنگل تھے، جنھیں پار کرنا مشکل تھا۔ چناں چہ ایک مدّت تک آریا لوگ وندھیاچل پہاڑ کے شمال ہی میں رہے۔ پھر اُن میں سے بہت سے لوگ جنگلوں کو پار کرکے جنوبی ہند تک پہنچ ہی گئے۔ لیکن بڑی تعداد میں یہ لوگ وہاں نہ جا سکے، اس لیے جنوبی ہند بڑی حد تک دراوڑ ہی رہا۔

آریوں کی ہندستان میں آمد کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے۔ پرانی سنسکرت کتابوں سے ان کا بہت کچھ حال تم معلوم کرسکتی ہو۔ ان میں بعض کتابیں، مثلاً وید، تو ضرور اسی زمانے کے لگ بھگ لکھی گئی ہوں گی۔ رگ وید قدیم ترین وید ہے اور اس سے ہمیں ہندستان کے اس حصے کا حال معلوم ہوتا ہے، جہاں آریوں نے اس وقت قبضہ کرلیا تھا۔ دوسرے ویدوں اور پرانوں جیسی سنسکرت کتابوں سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ آریا کس طرح پھیلتے ہی چلے گئے۔ ان قدیم سنسکرت کتابوں کے بارے میں تم شاید بہت کم باتیں جانتی ہو۔ لیکن جب بڑی ہوگی، تو بہت سی باتیں تمھیں معلوم ہوں گی۔ پُرانوں کے بہت سے قصے تو تم سن بھی چکی ہو۔ پرانوں کے بہت دنوں بعد رامائن لکھی گئی،

اور اس کے بعد مہابھارت کا نمبر آیا۔

ان ہی کتابوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آریا جب افغانستان اور پنجاب میں رہتے تھے، تو اس علاقے کو وہ 'برہما ورتا' کہتے تھے۔ ان دنوں میں افغانستان کا نام 'گندھارا' تھا۔ مہابھارت میں 'گندھاری' کا جو قصہ ہے، تمھیں یاد ہے؟ اُسے گندھاری اس لیے کہتے تھے کہ وہ گندھارا یا افغانستان کی رہنے والی تھی۔ اب تو افغانستان ایک جدا ملک ہے، لیکن اس زمانے میں ہندستان ہی کا ایک حصہ تھا۔ آریا جب گنگا و جمنا کے میدانوں میں آئے، تو اس علاقے کا نام انھوں نے 'آریاورت' رکھا۔

پرانے وقتوں کی اور قوموں کی طرح آریاؤں نے بھی اپنے شہر دریاؤں کے کنارے ہی آباد کیے۔ کاشی یا بنارس، پریاگ اور دوسرے بہت سے شہر دریاؤں ہی کے کنارے بسے ہیں۔

ہندستان میں آریاؤں کا رھن سہن

ہندستان میں آریائی نسل کے لوگ یقیناً پانچ چھ ہزار سال قبل، بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی پہلے، آئے ہوں گے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ایک ہی ہلّے میں وہ سب آگئے ہوں۔ ہوا یہ ہوگا کہ ان کے ایک دَل کے بعد دوسرا دَل، ایک قبیلے کے بعد دوسرا قبیلہ اور ایک خاندان کے بعد دوسرا خاندان آیا ہوگا، اور اس کا سلسلہ سیکڑوں سال تک ضرور جاری رہا ہوگا۔ ذرا سوچو تو! لمبے لمبے قافلے بناکر وہ سفر کرتے رہے ہوں گے اور ان کی گھرداری کا سارا سامان، چھکڑوں اور جانوروں پر لدا ہوا، اُن کے ساتھ ہوتا رہا ہوگا۔ آج کل کے سیلانیوں کی طرح تو وہ آتے نہیں رہے ہوں گے۔ کیوں کہ ان کے لیے واپس لوٹنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ تو لڑنے مرنے اور یہیں رہنے کے لیے آتے تھے۔ یہ تو میں تمھیں پہلے ہی بتلا چکا ہوں

کہ شمال مغرب کے پہاڑوں کو پار کرکے یہ لوگ یہاں آئے تھے — لیکن ان میں سے کچھ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے جہازوں میں سمندر ہی سمندر خلیج فارس سے ہوتے ہوئے دریائے سندھ تک پہنچے ہوں گے۔

یہ آریائی نسل کے لوگ تھے کیسے؟ ان کا بہت کچھ حال ان کتابوں سے ہمیں معلوم ہوجاتا ہے، جو انھوں نے لکھی تھیں۔ ان میں سے بعض کتابیں، جیسے وید ہیں، دنیا کی شاید سب سے پرانی کتابیں ہیں۔ شروع شروع میں غالباً وہ لکھی نہیں جاتی تھیں، بلکہ لوگ انھیں زبانی یاد کرلیتے تھے اور لوگوں کو سُناتے تھے، یا ان کا وِرد کیا کرتے تھے۔ یہ کتابیں سنسکرت میں لکھی گئی تھیں۔ ان کی زبان اتنی میٹھی ہے کہ اگر تم چاہو تو انھیں گا بھی سکتی ہو۔ آج بھی کوئی خوش آواز آدمی، جو سنسکرت بھی جانتا ہو، اگر ویدوں کو پڑھے، تو کانوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔ وید ہندوؤں کی بڑی متبرک کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن لفظ 'وید' کا مطلب کیا ہے؟ اس کے معنی ہیں "علم" — یعنی ویدوں میں وہ تمام باتیں ملتی ہیں، جو اس زمانے کے عقل مند آدمیوں نے، جنھیں رِشی اور مُنی کہا جاتا ہے، اپنے

تجربوں سے حاصل کی تھیں۔ ان دنوں میں ریل، تار اور سینما وغیرہ کا تو کوئی وجود نہ تھا، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان پڑھ یا جاہل ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ پرانے زمانے کے عقل مند آج کے عقل مند لوگوں سے زیادہ عقل رکھتے تھے۔ بہرحال وہ زیادہ عقل والے رہے ہوں، یا نہ رہے ہوں، لیکن انھوں نے ایسی عجیب وغریب کتابیں لکھیں، جن کی آج بھی تعریف کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات تو ظاہر ہی ہوجاتی ہے کہ پرانے وقتوں کے یہ آدمی تھے بڑے لوگ۔

جیساکہ میں اُوپر بتلاچکا ہوں، شروع شروع میں وید لکھے نہیں جاتے تھے، بلکہ زبانی یاد کیے جاتے تھے، اور اس طرح پورے پورے وید ایک نسل سے دوسری نسل کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ اس زمانے کے آدمیوں کا حافظہ ضرور بہت اچھا رہا ہوگا۔ آج ہم میں سے کتنے آدمی ہیں جو پوری پوری کتابیں زبانی یاد کرسکتے ہیں؟

وید جب لکھے گئے تھے، اس زمانے کو ویدوں کا زمانہ کہتے ہیں۔ ویدوں میں پہلا رگ وید ہے، جس میں وہ بھجن اور گیت ہیں جو اس زمانے کے آریا

گایا کرتے تھے۔ وہ لوگ اکل کھرے اور روکھے پھیکے نہیں، بلکہ بڑے خوش مزاج اور ان کے دل مسرّتوں اور ولولوں سے لبریز رہے ہوں گے، اور سرخوشی کے عالم میں انھوں نے یہ پیارے پیارے گیت کہے ہوں گے اور جھوم جھوم کر ان دیوتاؤں کے سامنے گاتے رہے ہوں گے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔

آریاؤں کو اپنی ذات پر اور اپنی قوم پر بڑا ناز تھا۔ خود لفظ 'آریا' کے معنی ہی 'شریف آدمی' ہیں — اعلا قسم کا آدمی، اور انھیں اپنی آزادی بہت عزیز تھی۔ وہ اپنی نسل کے ان لوگوں کی طرح نہیں تھے، جو آج ہندستان میں بستے ہیں، جن میں نہ تو کسی قسم کی ہمت ہے، اور نہ اپنی آزادی کے جانے کا احساس ہی ہے۔ پرانے زمانے کے آریوں کے لیے بےعزتی یا غلامی سے موت بہتر تھی[1]۔

وہ بہت اچھے لڑنے والے بھی تھے۔ سائنس کی بعض باتیں بھی انھیں معلوم تھیں، اور کھیتی باڑی تو

۱۔ یہ خط اس وقت لکھے گئے تھے، جب ہندستان آزاد نہیں ہوا تھا، اور یہاں انگریزوں کا راج تھا۔

وہ بہت اچھی جانتے تھے۔ کھیتی باڑی کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے اور ان سب چیزوں کی بے حد قدر کرتے تھے، جن سے کھیتی باڑی کے کاموں میں مدد مل سکتی تھی۔ بڑے بڑے دریاؤں سے انھیں پانی ملتا تھا، اس لیے وہ ان سے پیار کرتے تھے اور انھیں اپنا بڑا دوست اور سرپرست سمجھتے تھے۔ گائے بیل سے بھی کھیتی کے کاموں میں، اور روزانہ کی زندگی میں بھی، ان کو بہت مدد ملتی تھی۔ گائے تو دودھ ہی دیتی تھی، جس کی بہت قدر کرتے تھے۔ اسی لیے وہ ان جانوروں کی خاص طور سے دیکھ ریکھ کیا کرتے تھے، اور ان کے گُن گایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ گزرنے کے بعد گائے کے گن گائے جانے کی اصل وجہ تو لوگ بھول گئے، اور انھوں نے اسے پوجنا شروع کر دیا، جیسے اس سے کسی کو فایدہ پہنچ سکتا تھا۔

چوں کہ آریاؤں کو اپنے آپ پر بہت فخر تھا، اس لیے ہندستان کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ گھلنا ملنا وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ایسے قاعدے قانون بنائے، جن کے مطابق کوئی آریا کسی غیر آریا سے شادی بیاہ نہیں

کرسکتا تھا۔ بہت زمانہ گزرنے کے بعد یہی بات بڑھتے بڑھتے، وہ چیز بن گئی جسے آج ہم ذات پات کہتے ہیں۔ آج کل تو یہ بڑی ناسمجھی کی بات معلوم ہونے لگی ہے کہ کچھ لوگ ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے یا ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہوئے ڈریں۔ خوش قسمتی سے یہ باتیں اب کم ہوتی جارہی ہیں۔

★

رامائن اور مہابھارت

ہندستان میں 'ویدک زمانہ' ــــــ وہ زمانہ جب وید لکھے گئے تھے، ختم ہوا، تو 'رزمیہ شاعری' (جنگی کارناموں کی شاعری) کا دور شروع ہوا۔ اُسے رزمیہ شاعری کا دور اس لیے کہتے ہیں کہ اس دور میں جنگی کارناموں کی دو لمبی لمبی نظمیں لکھی گئیں، جن میں اس زمانے کے بڑے بڑے سورماؤں کے کارناموں کا ذکر ہے۔ یہ نظمیں 'رامائن' اور 'مہابھارت' ہیں، جن سے تم واقف ہو۔

رزمیہ شاعری کا دور شروع ہوا، تو آریا پورے شمالی ہند میں، وندھیاچل پہاڑ تک، پھیل چکے تھے، اور جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں، اس سارے حصے کو 'آریاورت' کہتے تھے۔ آج جسے 'صوبہ متحدہ' (اترپردیش) کہتے ہیں، اسے 'مدھ دیش' (ملک کا درمیانی حصہ)، اور بنگال کو 'ونگا' کہتے تھے۔

خواجہ غلام محمد صادق

پیش لفظ

"باپ کے خط بیٹی کے نام" جواہر لال نہرو کے ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنی بیٹی اندیرا کو ۱۹۲۸ء میں لکھے تھے۔ خطوں کے اس مختصر سے مجموعے میں دُنیا کے ابتدای دور کی کہانی بڑے ہلکے پھلکے اور دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ خط جب لکھے گئے تھے اس وقت اندیرا کی عمر صرف دس سال کی تھی، اس لیے مصنف نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا تھا کہ یہ کہانی اس طرح لکھی جائے کہ دس سال کی بچی اسے دل چسپی کے ساتھ پڑھ سکے، اور اس کے دل میں "دھیرے دھیرے یہ خیال گھر کرے کہ ہماری یہ دُنیا قوموں کا ایک گھرانا ہے"۔

ترجمے کی زبان آسان، عام فہم، اور طالب علم کی متوقع استعداد کے مطابق ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ایڈیشنوں میں جو تصاویر ملتی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تصویریں اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ ان اضافوں سے موضوع کی مزید وضاحت ہوتی ہے، اور پڑھنے والے کی دل چسپی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

قدرت کی کتاب کا ایک اور ورق — ایک مچھلی کا فاسل

ایک دل چسپ بات، جسے سن کر تم خوش ہو گی، یہ ہے کہ ہندستان کے نقشے پر اگر تم نظر ڈال کر اس بات پر غور کرو کہ ہمالہ اور وندھیاچل کے پہاڑوں کے درمیان میں کس جگہ آریاورت رہا ہوگا، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ اس علاقے کی شکل ہلال — نئے چاند کی سی ہے۔ اسی مناسبت سے آریاورت کو 'چاند کا دیس' بھی کہتے تھے۔ 'اِندُو' کے معنی بھی 'چاند' ہی ہیں، اس لیے آریاورت کو ہم 'اندُو کا دیس' بھی کہہ سکتے ہیں۔

آریا لوگوں کے لیے شاید ہلال میں بڑی کشش تھی۔ وہ ہر اس جگہ کو متبرک سمجھتے تھے، جس کی شکل ہلال نما ہوتی تھی — جیسے بنارس۔ نہ جانے یہ بات تمھیں معلوم ہے یا نہیں کہ الہ آباد میں گنگا کی شکل بھی ہلال ہی کی سی بن جاتی ہے۔

تم جانتی ہی ہو کہ رامائن میں رام اور سیتا کا، اور لنکا میں راون کے ساتھ ان کی جنگ کا حال نظم

۱۔ اندیرا کا گھریلو نام بھی 'اندو' ہی ہے اور اسی نام سے وہ پکاری جاتی تھیں۔

کیا گیا ہے۔ والمیکی نے یہ قصہ سنسکرت زبان میں لکھا تھا۔ بعد میں اور زبانوں میں اسے نظم کیا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور تلسی داس کی ہندی میں لکھی ہوئی 'رامائن' ہے۔

رامائن میں لکھا ہے کہ دکھنی ہندستان میں بندروں نے رام چندر جی کی بہت مدد کی تھی، اور ان کا سب سے بڑا ہیرو ایک لنگور تھا، جسے ہنومان کہتے تھے۔ رامائن کی کہانی دراصل آریوں کی دکھنی ہندستان کے رہنے والوں کے ساتھ جنگ کی کہانی ہے۔ اس لڑائی میں راون دکھنی ہندستان والوں کا لیڈر تھا، اور لنگور غالباً دکھنی ہندستان کے رہنے والوں کو کہا گیا ہوگا، جو کالے رنگ کے تھے۔

رامائن مزے دار کہانیوں سے بھری پڑی ہے، لیکن میں یہاں ان کا ذکر نہ کروں گا۔ تمھیں خود انھیں پڑھنا چاہیے۔

رامائن کے بہت دنوں کے بعد مہابھارت لکھی گئی، جو رامائن سے بہت زیادہ بڑی کتاب ہے۔ اس میں آریوں اور دراوڑوں کی لڑائی کا نہیں، بلکہ ان لڑائیوں کا حال ہے، جو آریوں نے آپس ہی

میں لڑی تھیں۔ جنگ کے قصّوں کو جانے بھی دیا جائے تو مہابھارت میں بڑے عمدہ خیالات اور اچھے اچھے قصّے بھرے پڑے ہیں۔ یہ کتاب، سب سے بڑھ کر، اس لیے بھی ہمیں پیاری معلوم ہوتی ہے کہ اسی میں بھاگوت گیتا بھی ہے، جو نظم نہیں، ایک نگینہ ہے۔

یہ وہ کتابیں ہیں، جو آج سے ہزاروں سال پہلے ہندستان میں لکھی گئی تھیں۔ کون لکھ سکتا تھا انھیں، سوا بہت بڑے آدمیوں کے؟ اگرچہ اتنی مدّت پہلے یہ کتابیں لکھی گئی تھیں، لیکن ہندستان میں آج بھی یہ جیتی جاگتی کتابیں ہیں، جن سے بچہ بچہ واقف ہے، اور جو بڑی عمر کے لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔

ضميمه

اس کتاب کا جو اُردو ایڈیشن 'کتابستان'
(الہ آباد) سے ۱۹۳۵ء میں شایع ہوا تھا،
اس میں بجائے تیس کے اکتیس خطوط تھے۔
یہ زاید خط انگریزی ایڈیشنوں میں نہیں ملتا۔
یہ "ایک اور خط" کتابستان کے ایڈیشن سے
نقل کیا جارہا ہے۔

ایک اُور خط

میں تم کو کچھ تصویری پوسٹ کارڈ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میرے لمبے اور رُوکھے پھیکے خطوں سے ان کو زیادہ پسند کروگی۔ ان کارڈوں پر ان مچھلیوں کی تصویریں ہیں، جو پتھر ہوگئی ہیں۔ یہ لندن کے عجایب خانے میں رکھی ہیں۔ یہ پتھر بنی ہوئی مچھلیاں تم نے وہاں دیکھی ہوں گی۔ بہرحال ان تصویروں سے تمھیں یہ معلوم ہوگا کہ پرانے زمانے کی مچھلیوں کی ہڈیاں کیسی تھیں۔

جیساکہ میں تمھیں بتلا چکا ہوں یہ پُرانے زمانے کے جانوروں اور پودوں کے خول (فاسل) ہیں، جو ہمیں چٹانوں، اور اور جگھوں میں ملے ہیں۔ جانوروں کے بدن کے نرم حصّے تو باقی نہیں رہے،

مگر سخت اور ہڈی والے حصے بہت عرصے تک کے لیے باقی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے بہت زیادہ جانوروں پر سمندر کی تہہ میں نرم مٹی آگئی۔ اس طرح وہ حفاظت سے رہ گئے۔ نرم مٹی ہوتے ہوتے سخت ہو گئی، اور سمندر کی سطح اُبھر کر خشک زمین ہوگئی۔ وہیں سے یہ پتھر بنی ہوئی چیزیں نکلی ہیں۔ اور ہم کو خشک حالت میں ملی ہیں۔

یہ ان ہی پتھر بنی ہوئی چیزوں کی تصویریں ہیں، جو چٹانوں میں تھیں[1]۔ یہ تصویریں بھی صاف نہیں ہیں۔ دو تو صرف خول ہی ہیں، یعنی اصل پتھر بنے ہوئے جانوروں کے صرف خاکے۔ ایک خاکے میں تو مچھلی کے صرف دانت ہی دانت نظر آتے ہیں۔

میرا یہ خیال ہے کہ سب سے زیادہ مزے دار تصویریں وہ ہیں، جن پر ۲۴ اور ۲۷ نمبر پڑے ہیں۔ یہ صاف صاف دکھلاتی ہیں کہ مچھلیوں نے اپنے نشان چٹانوں پر کیسے چھوڑے ہیں۔ ان ہی نشانوں سے اب لاکھوں برس کے

۱- کتابستان کے ایڈیشن میں کوئی تصویر بھی نہیں ہے۔ یہ وہی تصویریں ہوں گی جو پچھلے صفحات میں دی جا چکی ہیں۔

بعد ہم یہ بتلا سکتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ مچھلیاں موجود تھیں۔

ان تصویری پوسٹ کارڈوں کو اُن کاغذوں کے ساتھ، جن پر ان کا حال لکھا ہے، لفافوں میں احتیاط کے ساتھ رکھنا، تاکہ وہ اور کاغذوں میں نہ ہل جُل جائیں۔

یا پہاڑ کے ادھر ادھر پڑا دیکھتی ہو ممکن ہے وہ قُدرت کی کتاب کا ایک چھوٹا سا ورق ہو اور اس کے پڑھنے کا اگر تم کو گُر معلوم ہو جائے تو وہ شاید تمھیں کچھ بتا بھی سکے۔ کوئی بھی زبان ہو ــــ ہندی، اُردو، یا انگریزی، اس کو پڑھنے کے لیے پہلے اس زبان کی الف، ب سیکھنی ضروری ہے۔ اسی طرح پتھر اور چٹانوں کی کتابوں میں اگر تمھیں قدرت کی کہانی پڑھنی ہے تو پہلے تمھیں اس کی الف، ب سیکھنی ہوگی۔ ممکن ہے اس کا تھوڑا بہت پڑھنا بھی تمھیں آتا ہو۔ کوئی چھوٹی سی چمک دار کنکری اگر تمھیں کہیں نظر آتی ہے، تو کیا وہ تمھیں کچھ بتاتی نہیں؟ ذرا سوچو تو یہ کنکری اتنی چمک دار، گول اور چکنی بنی کیسے! تم کسی بڑے پتھر کو اگر توڑ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دو، تو ہر ٹکڑا کھُردرا ہوگا، جس میں بہت سے کونے ہوں گے اور ان کے کنارے ناہموار ہوں گے۔ یہ ٹکڑے اس کنکری جیسے گول اور چکنے نہ ہوں گے۔ پھر یہ کنکری اتنی چکنی اور چمک دار کیسے بن گئی؟ یہ اپنی کہانی تمھیں خود سُنائے گی، لیکن شرط یہ ہے کہ تمھارے پاس سُننے کے لیے تیز کان اور دیکھنے کے لیے تیز آنکھیں ہوں۔ یہ تمھیں بتائے گی کہ کسی زمانے میں، جسے اب

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بہت مدت گزر چکی ہے، وہ بھی پتھر کا ایک ٹکڑا ہی تھی، بالکل اسی پتھر یا چٹان کے ٹکڑوں کی طرح جسے تم توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دو، اور جس کے کنارے نوک دار اور کھُردرے ہوں۔ شاید یہ کسی پہاڑ پر ایک طرف پڑی تھی کہ برسات آئی اور اس کا پانی بہا کر اُسے ایک چھوٹی سی وادی میں لے آیا، جہاں اُسے ایک پہاڑی نالا مِل گیا۔ یہ نالا اسے ڈھکیلتا ہوا ندی میں لے گیا، اور ندی نے اس کو بڑے دریا میں پہنچا دیا۔ اس سارے سفر میں کنکری پانی کی تہہ میں لڑھکتی رہی، یہاں تک کہ رگڑ کھاتے کھاتے اس کے کنارے گھِس کر چمک دار اور چکنے ہو گئے اور اس طرح اس کی وہ شکل بن گئی جو تم نے دیکھی۔ کسی طرح اس کنکری کا اور دریا کا ساتھ چھوٹ گیا اور یہ تمھیں مل گئی۔ اگر دریا کے ساتھ یہ بہتی رہتی تو گھستے گھستے ریت کے ذرّے کے برابر ہو جاتی اور پھر سمندر کے کنارے اپنے بھائی بندوں میں مِل کر ساحل کی زینت بنتی، جہاں بچّے کھیلتے ہیں اور ریت کے قلعے بناتے ہیں۔

اگر ایک کنکری اتنا کچھ بتا سکتی ہے، تو سوچو کہ چٹانوں، پہاڑوں، اور اپنے ارد گرد کی بہت سی چیزوں سے ہم کیا کچھ نہیں جان سکتے!

ابتدائی تاریخ لکھی کیسے گئی!

میں نے کل اپنے خط میں تمھیں بتایا تھا کہ زمین کے شروع زمانے کی کہانی ہمیں قدرت کی کتاب میں پڑھنی ہوگی۔ اس میں وہ ساری چیزیں ملیں گی جو اپنے ارد گرد تم دیکھتی ہو، جیسے — چٹانیں، پہاڑ، وادیاں، دریا، سمندر اور آتش فشاں پہاڑ۔ یہ کتاب ہر وقت ہمارے سامنے کھلی رہتی ہے، لیکن ہم میں سے کم ہی لوگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں، یا اسے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم اسے پڑھنا اور سمجھنا سیکھ لیں تو کتنی ہی مزے مزے کی کہانیاں یہ ہمیں سنا سکتی ہے۔ پتھر کے ان صفحوں پر لکھی ہوئی جو کہانیاں ہم پڑھیں گے وہ پریوں کے قصّوں سے کہیں زیادہ مزے دار ہوں گی۔

بہرحال قدرت کی اس کتاب میں اُن پرانے وقتوں کا تھوڑا بہت حال تو ہم پڑھ ہی سکتے ہیں، جب اس زمین پر نہ کوئی انسان تھا اور نہ کوئی جانور۔ پھر جب ہم

آگے بڑھیں گے تو ہمیں پہلے جانور جنم لیتے دکھائی دیں گے، جن کی تعداد آگے چل کر بہت بڑھ جائے گی۔ پھر مرد اور عورتوں کی باری آئے گی، لیکن آج کے مرد اور عورتوں سے وہ بالکل مختلف دکھائی دیں گے۔ یہ بالکل وحشی اور جانوروں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوں گے۔ پھر انھیں رفتہ رفتہ تجربہ حاصل ہوتا ہے اور ان میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی یہی سوچنے کی صلاحیت ان کو حقیقی طور پر جانوروں سے بالکل مختلف بنادیتی ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو انھیں بڑے سے بڑے اور خوف ناک سے خوف جانور سے بھی زیادہ طاقت ور بنادیتی ہے۔ آج تم دیکھتی ہو کہ ایک چھوٹا سا آدمی پہاڑ جیسے ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے۔ ہاتھی کتنا بڑا اور کتنا طاقت ور جانور ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے مہاوت سے کہیں بڑھ کر طاقت ور، جو اس کی گردن پر سوار ہوتا ہے۔ لیکن مہاوت سوچ سکتا ہے، اور چوں کہ وہ سوچ سکتا ہے، اسی لیے آقا بن جاتا ہے، اور ہاتھی اس کا غلام۔ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جوں جوں بڑھی وہ عقل مند اور چالاک ہوتا گیا۔ بہت سی نئی نئی باتیں اسے آگئیں ـــــ مثلاً

آگ کیسے جلائی جائے، زمین کو جوت بو کر کھانے کے لیے اناج کیسے اُگایا جائے، پہننے کے لیے کپڑے اور رہنے کے لیے مکان کیسے بنائے جائیں۔ بہت سے مردوں اور عورتوں نے مِل جُل کر ایک جگہ رہنا شروع کیا اور اس طرح پہلی بستیاں بسیں۔ بستیاں بسنے سے پہلے لوگ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرا کرتے تھے، اور شاید خیموں جیسی کسی چیز میں رہتے تھے۔ اس وقت تک انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زمین سے اناج کیسے اُگایا جائے۔ ان کے پاس نہ تو چاول تھا اور نہ گیہوں، جس سے روٹی بنتی ہے۔ سبزیاں بھی نہیں تھیں، اور بہت ساری چیزیں جو آج تم کھاتی ہو، اس وقت تک انھیں کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ کھانے کے لیے بس جنگلی پھل پھلیریاں شاید کچھ رہی ہوں گی۔ زیادہ تر شکار کیے ہوئے جانوروں ہی کے گوشت پر ان کا گزارا ہوتا رہا ہوگا۔

بستیاں جیسے جیسے بڑھیں، لوگوں کو بہت سے اچھے اچھے کام بھی آنے لگے۔ انھیں لکھنے کا ڈھنگ بھی آگیا، لیکن ایک زمانے تک ان کے پاس لکھنے کے لیے کاغذ نہیں تھا، بھوج پتر کی چھال پر لوگ لکھا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بھوج پتر کے پیڑ کو

انگریزی میں برچ[1] کہتے ہیں۔ کھجور کے پتّوں پر بھی لکھائی ہوتی تھی۔ آج بھی بہت سے کُتب خانوں میں پُرانے زمانے کی پوری پوری کتابیں محفوظ ہیں، جو کھجور کے پتّوں پر لکھی گئی تھیں۔ پھر کاغذ بنا اور لکھنا آسان ہوگیا۔ لیکن چھاپے خانے نہیں تھے اور آج کی طرح ہزاروں کی گنتی میں کتابیں نہیں چھپ سکتی تھیں۔ ایک وقت میں بس ایک ہی کتاب لکھی جاسکتی تھی اور پھر ہاتھ سے نقل کی جاتی تھی۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں بہت سی کتابیں لکھی نہیں جاسکتی تھیں۔ آج کل کی طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی کتاب کی دوکان میں، یا کسی بُک اسٹال پر، تم گئیں اور جس کتاب کی ضرورت ہوئی خرید لی۔ اس زمانے میں تو اس کے لیے تمھیں کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈنا پڑتا، جو اسے نقل کر دے، اور اس میں بڑا وقت لگتا۔ لیکن اُس زمانے کے لوگ لکھتے بہت اچھا تھے۔ آج بھی ہمارے کتب خانوں میں ہاتھ سے بہت ہی خوش خط لکھی ہوئی پُرانی کتابیں محفوظ

۱- Birch : شمالی یورپ کا ایک جنگلی درخت، جس کی چھال، سفید، چکنی اور مضبوط ہوتی ہے۔

ہیں۔ ہندستان میں بھی بہت سی قلمی کتابیں، خاص کر سنسکرت، فارسی اور اُردو کی، ملتی ہیں۔ اکثر نقل کرنے والے کتاب کے حاشیوں پر خوب صورت بیل بوٹے بھی بناتے تھے۔

شہروں اور بستیوں کے بڑھنے کے ساتھ رفتہ رفتہ ملک بنے اور قومیں بنیں۔ جو لوگ ایک ہی مُلک میں ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے وہ قُدرتاً ایک دوسرے کو زیادہ جانتے تھے۔ وہ خود کو دوسرے ملکوں میں رہنے والوں سے اچھا سمجھتے اور اپنی بے وقوفی میں ان سے لڑتے بھی تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، اور آج بھی بہت سے لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے، کہ لڑائی جھگڑے اور ایک دوسرے کی جان لینے سے زیادہ احمقانہ اور کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اس سے کسی کو فایدہ نہیں پہنچتا۔

اگلے وقتوں کے شہروں اور ملکوں کے قصّے پڑھنے کے لیے ہمیں اکثر پُرانی کتابیں مل تو جاتی ہیں، مگر اس طرح کی کتابیں ہیں بہت کم۔ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن سے ہمیں مدد ملتی ہے — جیسے پتھروں کی لاٹیں اور چٹانیں، جن پر پُرانے زمانے کے بادشاہ اور شہنشاہ

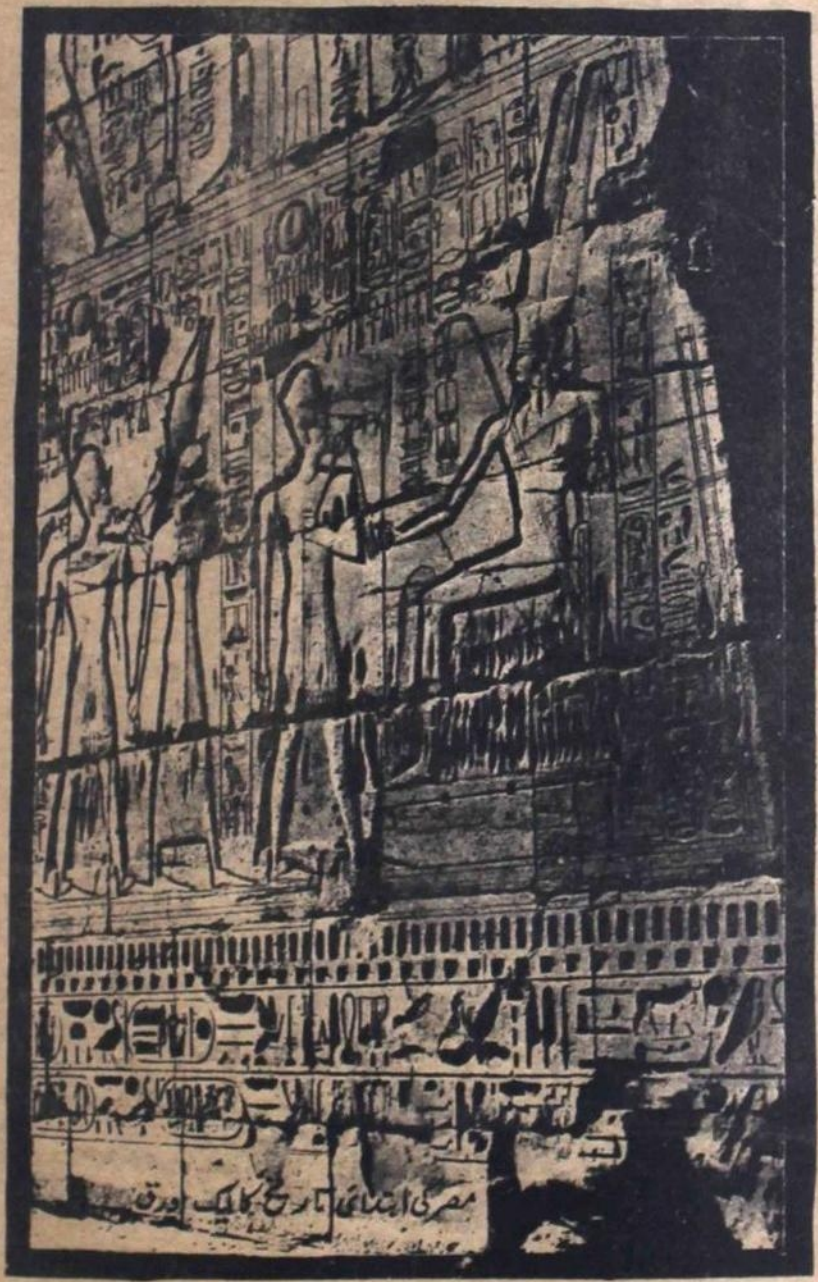

مصری ابتدائی تاریخ کا ایک ورق

جگہ جگہ حسبِ ضرورت حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

پیش نظر کتاب کے ان ہی پہلوؤں نے اس کی اہمیت و افادیت بڑھادی ہے۔ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں، اور خاص کر اُردو میں، کم عمر بچّوں کے لیے عام معلوماتی کتابوں کی جو کمی ہے، اس کی شکایت عام ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اردو میں یہ کمی اس کتاب سے شاید کچھ حد تک دُور ہو سکے گی، اور کم از کم ثانوی جماعتوں کے طالب علم اس سے فایدہ اُٹھا سکیں گے۔

مجھے خوشی ہے کہ 'سوویٹ روس' کی اشاعت کے ایک ہی ماہ بعد، 'نہرو انسٹیٹوٹ اف ڈماکریٹیک سوشلزم' نے حسبِ وعدہ جواہر لال نہرو کی تصانیف کے سلسلے کی دوسری جلد بھی شایع کردی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ حضرات جو جواہر لال نہرو کے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، نہرو انسٹیٹوٹ کی ہر ممکن امداد سے دریغ نہ کریں گے۔

۵۔ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

۲۲ دسمبر ۱۹۶۹ء

غلام محمد صادق

اپنے زمانے کا حال کندہ کرادیتے تھے۔ کتابیں زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہتیں۔ ان کا کاغذ گل سڑ جاتا ہے، یا کیڑے کھا جاتے ہیں۔ لیکن پتھر تو کاغذ سے کہیں زیادہ مدت تک باقی رہتا ہے۔ شاید تمھیں یاد ہو کہ الہ آباد کے قلعے میں تم نے اشوک کی لاٹ دیکھی تھی۔ اشوک، جو صدیوں پہلے ہندستان کا ایک بڑا نامی بادشاہ تھا، اس کا ایک فرمان پتھر کی اس لاٹ پر کندہ ہے۔ اگر تم لکھنؤ کا عجایب گھر دیکھو تو وہاں پتھروں کے بہت سے ٹکڑے تمھیں ملیں گے جن پر عبارتیں کندہ ہوں گی۔

مختلف ملکوں کے پُرانے وقتوں کی تاریخ پڑھتے وقت ہمیں معلوم ہوگا کہ اب سے بہت پہلے، جب یورپ کے زیادہ تر مُلک وحشی قبیلوں سے بھرے پڑے تھے، اس وقت چین اور مصر کے لوگوں نے بڑے بڑے کام کیے تھے۔ ہندستان کے اس شان دار زمانے کا حال بھی ہم پڑھیں گے، جب رامائن اور مہا بھارت لکھی گئی تھیں اور ہندستان ایک دولت مند اور طاقت ور مُلک تھا۔ آج ہمارا دیس بہت غریب ہے اور ایک دوسرے مُلک کے لوگ

ہم پر حکومت کرتے ہیں، ہم اپنے ملک میں بھی آزاد نہیں ہیں اور اپنی مرضی کے مُطابق جو چاہیں نہیں کرسکتے ہیں[1]۔ لیکن ایسی حالت ہمیشہ تو نہیں تھی! ہم اگر جان توڑ کوشش کریں تو اپنے ملک کو پھر آزاد کرا سکتے ہیں[2]۔ تاکہ ہمارے دیس کے غریبوں کی حالت سُدھرے اور ہندستان بھی رہنے کے لیے اتنی ہی اچھی جگہ بن جائے جیسے آج یورپ کے بعض مُلک ہیں۔

میں اپنے اگلے خط میں دُنیا کی دل چسپ کہانی بالکل ابتدائی دَور سے شروع کروں گا۔

★

۱۔ یہ خطوط ۱۹۲۸ء میں لکھے گئے تھے، اس وقت ہندستان میں انگریز راج کرتے تھے۔

۲۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزی راج ختم ہوگیا، اور اب ہمارا مُلک آزاد ہے۔

یہ تو تم جانتی ہو کہ دُنیا سُورج کے گِرد گھومتی ہے اور چاند دُنیا کے گرد۔ شاید یہ بھی تمھیں معلوم ہے کہ زمین کی طرح اور بھی آسمانی گولے، یا 'اجرام فلکی' ہیں جو سُورج کے گرد چکّر کاٹا کرتے ہیں۔ یہ سب، جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے، سُورج کے سیّارے کہلاتے ہیں۔ چاند زمین کا طفیلی سیّارہ ہے، کیوں کہ وہ زمین کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ اسی طرح دوسرے سیّاروں کے بھی طفیلی سیّارے ہیں، جو ان کے گرد گھُوما کرتے ہیں۔ سُورج، سیّارے اور ان کے طفیلی سیّارے مِل جُل کر ایک خوش و خرّم گھرانا بنا لیتے ہیں، جسے 'نظامِ شمسی' کہتے ہیں۔

رات کو آسمان پر ہزاروں تارے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند ہی 'سیّارے' ہیں جن کو کسی طرح بھی 'ستارے' نہیں کہا جا سکتا۔ کیا تم 'سیّارے' اور

'ستارے' میں تمیز کرسکتی ہو؟ ستاروں کے مقابلے میں سیارے بالکل ہماری زمین کی طرح بہت ننھے منّے سے ہوتے ہیں، لیکن وہ ہماری دُنیا سے چوں کہ بہت قریب ہیں اسی لیے ہمیں بہت بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیسے چاند جو ایک ننّھا سا سیارہ ہے ہم سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو اتنا بڑا نظر آتا ہے۔ سیاروں اور ستاروں میں تفریق کرنے کی اصلی کسوٹی تو جھلملاہٹ ہے۔ ستارے جھل مِل جھل مِل کرتے ہیں اور سیارے جھل ملاتے نہیں بلکہ چمکتے ہیں، اور یہ چمک ان کو ہمارے سُورج کی روشنی سے ملتی ہے۔ سیاروں کی چمک ہو، یا چاند کی، یہ حقیقتاً سُورج ہی کی روشنی کا عکس ہے۔ لیکن حقیقی ستارے بالکل ہمارے سُورج جیسے ہوتے ہیں اور خود اپنی روشنی سے چمکتے ہیں کیوں کہ وہ بہت تیز جلتے اور دہکتے رہتے ہیں۔ دراصل خود ہمارا سورج بھی ایک ستارہ ہی ہے۔ چوں کہ یہ ہم سے قریب تر ہے اس لیے ہمیں ایک بڑے آگ کے گولے کی طرح نظر آتا ہے۔

غرض ہماری زمین سورج کے خاندان، یا نظام شمسی سے متعلق ہے۔ ہم اپنی زمین ہی کو بہت بڑا سمجھتے ہیں،

اور ہمارے چھوٹے سے قد کے دیکھتے تو واقعی وہ ہے بھی بڑی۔ اس کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے تک سفر کرنے میں تیز رفتار ریل اور اسٹیمر کے باوجود ہفتے اور مہینے لگ جاتے ہیں۱۔ لیکن ہمیں اتنی بڑی لگنے کے باوجود زمین کی حیثیت ہوا میں تیرتے ہوئے ایک ذرّے سے زیادہ نہیں۔ سُورج کروڑوں میل دُور ہے اور دوسرے ستارے تو اور بھی زیادہ دُور ہیں۔

علم ہیئت جاننے والے، جو ستاروں کا مُطالعہ کرتے ہیں، ہمیں بتاتے ہیں کہ اب سے بہت پہلے ہماری زمین اور دوسرے سیّارے سورج ہی کا حصّہ تھے۔ سُورج اس وقت بھی آگ کا دہکتا ہوا گولہ تھا۔ کسی وجہ سے اس کے کچھ حصّے ٹوٹ کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئے اور خلا میں تیرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے باپ —— سُورج سے بالکل چھٹکارا نہیں مِلا۔ یہ سورج کے گرد چکّر کاٹنے لگے، جیسے کسی نے انھیں رسّی سے باندھ دیا ہو۔ یہ عجیب و غریب طاقت، جسے میں نے رسّی سے تشبیہ دی ہے، ایک قوّت ہے جو چھوٹی چیزوں کو بڑی

۱۔ اب ہوائی جہاز نے یہ مسافت دنوں کی کر دی ہے۔

چیز کی طرف کھینچتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کی وجہ سے چیزیں اپنے وزن سے نیچے ہی کی طرف گرتی ہیں۔ ہمارے قریب جو چیزیں ہیں، ان میں زمین ہی سب سے بڑی چیز ہے، اس لیے ہماری ہر چیز کو وہی اپنی طرف کھینچتی ہے۔

سورج سے الگ ہوکر بھاگ نکلنے والے حصّوں میں ہماری زمین بھی ہے۔ شروع میں یہ بھی بے حد دہکتی رہی ہوگی اور اس کے ارد گرد گرم گیسوں اور ہوا کا ہجوم رہا ہوگا۔ لیکن چوں کہ یہ سورج کے دیکھتے بہت ہی چھوٹی چیز تھی، اس لیے رفتہ رفتہ یہ ٹھنڈی ہونے لگی۔ خود سورج کی گرمی بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ٹھنڈے ہونے میں کروڑوں برس لگ جائیں گے، لیکن زمین کے ٹھنڈے ہونے میں بہت کم وقت لگا۔ جب یہ گرم تھی اس وقت ظاہر ہے کہ اس پر کوئی جان دار چیز زندہ نہیں رہ سکتی تھی، نہ آدمی، نہ جانور، نہ پیڑ پودے۔ اس وقت تو جو چیز بھی ہوتی، جل کر راکھ ہو جاتی۔

جس طرح سورج کا ایک حصّہ ٹوٹ کر زمین بن گیا، اسی طرح زمین کا ایک حصّہ ٹوٹ کر چاند بنا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ امریکا اور جاپان کے بیچ میں جو بہت

بڑا سمندر، بحرُ الکاہل، ہے یہیں سے زمین کا وہ حصّہ الگ ہوا تھا جو چاند بن گیا۔

غرض زمین ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی، مگر اِس میں بڑا زمانہ لگا۔ اس کا اوپری حصّہ تو رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو گیا، لیکن اندرونی حصّے میں گرمی بھری رہی۔ آج بھی اگر تم کوئلے کی کھان میں جاؤ تو جوں جوں نیچے جاؤ گی گرمی بڑھتی جائے گی۔ اگر کسی طرح تم زمین کے اندر بہت گہرائی تک پہنچ سکو تو تم دیکھو گی کہ اندر سے وہ بالکل سُرخ انگارہ ہو گی۔ چاند بھی ٹھنڈا ہونا شروع ہوا، اور چوں کہ یہ زمین سے بھی بہت چھوٹا تھا اس لیے زمین کے مُقابلے میں جلدی ٹھنڈا ہو گیا۔ چاند کی روشنی کتنی فرحت انگیز ہوتی ہے! ہوتی ہے نا؟ اسی سے تو اس کو 'خنک چاند' کہتے ہیں۔ شاید یہ برف کے دریاؤں اور برفیلی چٹانوں سے بھرا پڑا ہے۔

جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو ہوا کی ساری نمی یا بھاپ جم کر قطروں میں بدل گئی، اور شاید پانی بن کر برسنے لگی۔ کس قیامت کی بارش اُس زمانے میں ہوئی ہو گی! یہ سارا پانی زمین کے بڑے بڑے گڈھوں میں بھر گیا اور اس طرح بڑے

سمندر بنے۔

زمین جوں جوں ٹھنڈی ہوئی اسی کے ساتھ سمندروں کا پانی بھی ٹھنڈا ہوتا گیا اور اب زمین پر اور سمندر میں زندگی کا وجود ممکن ہوسکا۔

اگلے خط میں ہم زندگی کے آغاز پر باتیں کریں گے۔

★

پھلی جان دار چیزیں

پچھلے خط میں ہم نے دیکھا تھا کہ شروع میں ایک مدّت تک زمین اتنی گرم تھی کہ اس پر کسی جان دار چیز کا زندہ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر زمین پر زندگی کا آغاز ہوا کب ؟ اور پہلے پہل کن جان دار چیزوں نے جنم لیا؟ یہ سوال ہے تو بڑا دل چسپ، لیکن اس کا جواب بھی اتنا ہی مُشکل ہے۔ آؤ پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ 'جان' کہتے کس کو ہیں ؟ تم غالباً کہو گی کہ انسان جان دار ہوتے ہیں، اور اسی طرح جانوروں میں بھی جان ہوتی ہے، لیکن پھر یہ پیڑ، جھاڑیاں، پھول اور ترکاریاں وغیرہ کیا ہیں ؟ یہ سب بھی یقیناً جان دار چیزیں ہیں۔ یہ بھی بڑھتی ہیں، پانی پیتی ہیں، سانس لیتی ہیں، اور مرجاتی ہیں، حیوان اور پودے میں خاص فرق صرف اتنا ہے کہ پیڑ پاؤں چل پھر نہیں سکتے۔ تمھیں شاید یاد ہو! میں نے کچھ پودے تمھیں

لندن کے کیو گارڈن[1] میں دکھلائے تھے۔ ان میں سے ایک تو ثعلب مصری[2] کا پودا تھا، اور ایک صراحی نما پودا[3] تھا۔ یہ دونوں پودے واقعی مکھیاں کھاتے ہیں۔ پھر کچھ جانور بھی ایسے ہیں جو سمندر کی تہہ میں رہتے ہیں، مثلاً اسفنج[4]، اور اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتے، بعض وقت تو یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ یہ جانور ہے یا پودا، جب تم علم نباتات[5]، یعنی پیڑ پودوں سے متعلق علم پڑھوگی، یا علم حیوانات[6]، یعنی جانوروں سے متعلق علم، کا مطالعہ کروگی، تو تم خود ان عجیب و غریب چیزوں کو دیکھوگی جو نہ تو پورے طور پر جانور ہیں اور نہ پورے طور پر پودے ہی ہیں۔

۱۔ Kew Gardens: یہ انگلستان کا سرکاری نباتاتی باغ ہے، جو تین سو ایکڑ میں پھیلا ہے۔ ۱۸۴۱ء میں قایم ہوا تھا۔ یہ جگہ سرکاری نباتاتی تجربہ گاہ کا بھی کام دیتی ہے۔

۲۔ Orchid

۳۔ Pitcher plant

۴۔ Sponge

۵۔ Botany

۶۔ Zoology

یہ کتاب اور آنے والی کتابیں

"باپ کے خط بیٹی کے نام" جواہر لال نہرو کی تصانیف کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اسی مناسبت سے اس جلد پر نمبر "۲" درج کیا گیا ہے۔ 'سوویٹ روس' جو اس سے پہلے شایع ہوئی ہے، اس پر نمبر "۱" درج ہے۔ آگے آنے والی کتابوں کی ترتیب وار فہرست یہ ہے:

جگ بیتی	دو جلدوں میں
آپ بیتی	دو جلدوں میں
مضامین	تین جلدوں میں
تلاشِ ہند	دو جلدوں میں
کچھ پرانے خطوط	دو جلدوں میں
نہرو کے خط بہن کے نام	ایک جلد
اشاریہ	ایک جلد

اس طرح سے جواہر لال نہرو کی تصانیف کا پورا سیٹ پندرہ جلدوں پر مشتمل ہوگا۔

بعض لوگوں کا تو کہنا ہے کہ پتھر اور چٹانوں میں بھی ایک طرح کی جان ہوتی ہے اور انھیں بھی ایک طرح سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے، لیکن اسے دیکھنا مشکل ہے۔ تمھیں شاید یاد ہو جینوا[1] میں ہم سے ملنے ایک صاحب آئے تھے، ان کا نام سر جگدیش چندر بوس[2] ہے۔ انھوں نے تجربے کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ پودوں میں بھی جان ہوتی ہے، بلکہ ان کا تو خیال ہے کہ پتھروں میں بھی ایک طرح کی جان ہوتی ہے۔

ہاں! تو یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ کون چیز جان دار ہے اور کون چیز جان دار نہیں ہے۔ اچھا ابھی پتھروں کو تو ہم چھوڑ دیں اور صرف پودوں اور جانوروں ہی کو لیں۔ آج ہماری دُنیا میں جان دار چیزوں کی کثرت ہے، جو طرح طرح ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ ان میں سے کچھ تو بہت چالاک ہیں اور بعض بالکل بُدھو۔ یہی

۱۔ Geneva ـــــ یورپ کے ایک خوب صورت ملک سوئزرلینڈ (Switzerland) کی راج دھانی۔

۲۔ جگدیش چندر بوس (۱۸۵۸ء- ۱۹۳۷ء) ہندستان بلکہ دُنیا کے بڑے ماہر علمِ نباتات تھے۔

حال جانوروں کا بھی ہے۔ ان میں سے بعض تو بہت چالاک ہیں۔ جیسے ہاتھی بندر، چیونٹیاں، لیکن کچھ بہت بے وقوف بھی تمھیں ملیں گے ــــ جیسے مچھلیاں اور بہت سی سمندری مخلوق جو زندگی کے نظام میں بہت پست اور نیچے درجے کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان میں بھی سب سے نچلے درجے میں اسفنج[1]، جیلی مچھلی[2] جیسی مخلوق ہیں جو نصف حیوان اور نصف نباتات ہیں۔

ہمیں یہ پتا لگانا ہے کہ یہ سارے مختلف قسم کے 'جان دار' ایک دم سے پیدا ہوئے یا رفتہ رفتہ اور ایک ایک کر کے انھوں نے جنم لیا۔ اس کا پتا چلے کیسے؟ اس پرانے زمانے کی باقاعدہ لکھی ہوئی کتابیں تو ہیں نہیں، لیکن کیا ہماری وہی 'قدرت کی کتاب' اس معاملے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتی؟ ہاں! وہ یقیناً مدد کرتی ہے۔ پرانی چٹانوں میں جانوروں کی ہڈیاں ہمیں ملتی ہیں، جنھیں فاسل[3] کہتے ہیں۔ ہمیں جب ایسی ہڈیاں ملتی ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں

۱۔ Sponge

۲۔ Jelly-fish

۳۔ Fossil

کہ پہلے، بہت پہلے، جب یہ چٹانیں بنی تھیں اس وقت یہ جانور ضرور رہے ہوں گے، جن کی یہ ہڈیاں ہیں۔ لندن کے ساؤتھ کن سنگ ٹن میوزیم[1] میں تم نے طرح طرح کے چھوٹے بڑے بہت سے فاسل[2] دیکھے تھے۔

جب کوئی جانور مرتا ہے، تو اس کے جسم کے نرم اور گوشت والے حصّے جلد ہی گل سڑ جاتے ہیں، لیکن اس کی ہڈیاں بہت دنوں تک باقی رہتی ہیں۔ یہی ہڈیاں جب ہمیں مل جاتی ہیں تو ان ہی سے پُرانے زمانے کے جانوروں کا تھوڑا بہت حال بھی ہمیں معلوم ہوجاتا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ کوئی ایسا جانور رہا ہو جس کے ہڈیاں نہ رہی ہوں، جیسے جیلی مچھلی۔ یہ بے ہڈی کے جانور جب مرے ہوں گے تو ان کا تو کوئی حصّہ بھی باقی نہ رہ گیا ہوگا۔

جب ہم چٹانوں کو غور سے دیکھتے ہیں اور پرانی فاسل

۱۔ South Kensington Museum : کن سنگ ٹن لندن کا ایک مشہور محلہ ہے، جس کے جنوبی علاقے میں بہت سے میوزیم اور گیلریاں بھی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک میوزیم کا نام British Museum of Natural History ہے۔

ہڈیاں جمع کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف قسم کے جانور رہے ہیں۔ یہ سب کے سب اک بارگی تو کہیں سے ٹپک نہیں پڑے تھے۔ پہلے بہت معمولی اور سیدھی سادھی بناوٹ کے خول دار جانور تھے، جیسے گھونگھا مچھلی[1]۔ سمندر کے کنارے تمھیں جو خوب صورت گھونگھے ملتے ہیں۔ یہ سب اسی قسم کے خول دار، مرے ہوئے، جانوروں کے سخت خول ہیں۔ آگے چل کر جو جانور ملتے ہیں ان کی بناوٹ زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ جیسے سانپ یا بڑے بڑے جانور جو آج کل کے جانوروں سے ملتے جلتے ہیں۔ سب سے آخر میں آدمی کا نشان ہمیں ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سب جان دار ایک خاص ترتیب کے ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ پہلے سیدھے سادھے معمولی جانور وجود میں آئے، پھر پیچیدہ بناوٹ کے جانور پیدا ہوئے اور یہاں تک کہ آخر میں سب سے اعلا قسم کے جانور یعنی انسان نے جنم لیا۔ اسفنج اور گھونگھا مچھلی جیسے معمولی جان داروں نے کس طرح اپنے اندر اتنی تبدیلیاں پیدا کیں اور کیسے اتنی ترقی کی! اس کا مطالعہ بھی بے حد دل چسپ ہے۔

---

1 Shell-fish

اس کے بارے میں بھی کسی دن شاید میں تمھیں بتاؤں۔ لیکن اس وقت تو ہم شروع زمانے کے جانوروں کی باتیں کر رہے ہیں۔

زمین جب ٹھنڈی ہوئی تو سب سے پہلے جس جان دار نے جنم لیا وہ شاید نرم اور جیلی جیسے مادّے کی شکل کا تھا، جس پر نہ کوئی خول تھا اور نہ جس کے ہڈی تھی اور جو سمندر ہی میں رہتا تھا۔ چوں کہ وہ بے ہڈی کے تھے اس لیے ان کے فاسل بھی ہمیں نہیں ملتے۔ ان کے بارے میں تو بس ہم اپنی عقل اور سمجھ ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ آج بھی سمندر کی تہہ میں اسی طرح کے جیلی جیسے مادّے کی شکل کے بہت سے جان دار ملتے ہیں۔ ہوتے تو یہ گول ہیں لیکن ان کے نہ تو ہڈیاں ہوتی ہیں اور نہ خول۔ اسی لیے ہر لمحے ان کی شکل بدلتی رہتی ہے وہ کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:

ان شکلوں کے بیچ میں جو دھبّے ہیں ان پر تم نے غور کیا! اسی کو مرکوزہ[1] کہتے ہیں۔ اس کی حیثیت کچھ دل

۱۔ مرکزہ (Nucleus) انڈے، بیج، نباتی اور حیوانی خلیے کا مرکزی حصہ۔

جیسی ہوتی ہے۔ یہ جانور، یا یہ جو بھی ہوں، ان کا ایک عجیب ڈھنگ یہ ہے کہ خود کو یہ دو حصّوں میں بانٹ کر ایک سے دو بن جاتے ہیں۔ ان کے جسم کا کوئی حصّہ ایک جگہ سے پتلا ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ٹوٹ کر جیلی ہی جیسی دو چیزیں بن جاتے ہیں اور ان دونوں کی شکل اصل ہی کی سی رہتی ہے۔ یہ تقسیم کچھ اس شکل میں ہوتی ہے:

تم نے دیکھا! یہ مرکزہ، یا دل، بھی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور دونوں حصّوں کو اس کا ایک ایک ٹکڑا مل جاتا ہے۔ اسی طرح یہ جان دار تقسیم ہوکر بڑھتے رہتے ہیں۔

ہماری زمین کے پہلے جان دار بھی ایسی ہی کوئی چیز رہے ہوں گے۔ کتنی سادہ اور حقیر تھی زندگی کی یہ علامت! لیکن اس وقت تو ساری دُنیا میں ان سے بہتر اور بلند تر کوئی دوسری چیز تھی ہی نہیں، کیوں کہ حقیقی جانور تو ابھی وجود میں آئے ہی نہیں تھے اور آدمی کے

آنے میں تو ابھی لکھوکھا سال باقی تھے۔

ان جیلی نما چیزوں کے بعد کائی، گھونگھوں، کیکڑوں، اور کیڑوں نے جنم لیا، پھر مچھلیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں، کیوں کہ ان کی ہڈیاں یا خول تھے، جو ہمارے لیے وہ چھوڑ گئی ہیں تاکہ اتنے زمانے کے بعد بھی ہم ان کے بارے میں جان سکیں اور ان کا مطالعہ کر سکیں۔ یہ خول سمندر کی تہہ میں کیچڑ یا گارے میں پڑے رہ گئے تھے۔ ان پر تازے کیچڑ اور ریت کی تہ جمی رہی جس نے انھیں محفوظ کر دیا۔ پھر یہ کیچڑ یا گارا اوپر کی ریت اور گارے کے دباؤ سے سخت ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے اس نے چٹان کی شکل اختیار کر لی۔ سمندر کی تہہ میں چٹانیں اسی طرح بنی تھیں۔ پھر زلزلے یا کسی دوسری وجہ سے یہ چٹانیں سمندر سے باہر نکل آئیں اور خشک زمین بن گئیں، پھر دریا اور باش کا پانی انھیں بہالے گیا اور گھونگھے جو جگہ جگہ ان کے اندر چھپے تھے وہ بھی نکل پڑے۔ یہی گھونگھے اور فاسل ہیں جو ہمارے ہاتھ آتے ہیں اور ان کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس کا پتا چلاتے ہیں کہ پرانے زمانے میں، آدمیوں کے وجود سے بہت پہلے، ہماری زمین کیسی تھی۔

اگلے خط میں ہم اس پر غور کریں گے کہ یہ سیدھے سادھے جان دار ترقی کر کے کس طرح آج جیسے جان دار بن گئے۔

*

جانوروں کا آنا

ہم نے دیکھا کہ زمین پر زندگی کے ابتدائی آثار غالباً معمولی سمندری جان داروں اور پودوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ یہ صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے تھے، اور پانی سے باہر آتے ہی سوکھ کر ان کا مرجانا اسی طرح یقینی تھا، جیسے آج جیلی مچھلی اگر بھٹک کر ساحل پر آجاتی ہے تو سوکھ کر مرجاتی ہے، لیکن اس وقت تو آج کے زمانے سے کہیں زیادہ پانی کی افراط اور دلدل کی خوب کثرت رہی ہوگی، لیکن وہی جیلی مچھلیاں اور دوسرے سمندری جانور جن کی کھال نسبتاً مضبوط تھی وہ خشکی پر زیادہ دیر تک ٹھہر سکتے تھے، کیوں کہ انھیں خشک ہونے میں دیر لگتی۔ غرض یہ نرم جیلی مچھلیاں اور ان کے جیسے دوسرے جان دار جو خشک زمین پر زندہ نہیں رہ سکتے تھے رفتہ رفتہ کم ہونے لگے اور ان کے مقابلے میں سخت خول والے جان داروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہ بہت دل چسپ اور

اہم بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جان دار آہستہ آہستہ اپنے ماحول یا اردگرد کے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ لندن کے ساؤتھ کن سنگ ٹن میوزیم میں تم نے دیکھا تھا کہ جاڑوں میں، اور خاص کر ان ملکوں میں جہاں جاڑوں میں برف بہت گرتی ہے، جانور اور پرندے بھی برف ہی کی طرح کیسے سفید بن جاتے ہیں۔ گرم ملکوں میں، جہاں ہریالی ہوتی ہے اور درخت خوب ہوتے ہیں، وہاں یہ سبز یا کوئی اور گہرا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کو اپنے ماحول کے مطابق بناتے ہیں، اور دشمنوں سے اپنے کو بچانے کے لیے وہ اپنے رنگ میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا رنگ اگر اپنے اردگرد کے رنگ کے مطابق ہو تو آسانی سے نظر نہیں آسکتے۔ سرد ملکوں کے جانور جاڑوں میں خود کو گرم رکھنے کے لیے اپنے جسم پر سمور یا نرم بال بڑھا لیتے ہیں۔ اسی لیے شیر کا رنگ زرد اور اس کے جسم پر دھاریاں ہوتی ہیں — جیسے جنگل میں سورج کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر آرہی ہو۔ اسی وجہ سے گھنے جنگل میں شیر آسانی سے نظر نہیں آتا۔

یہ دل چسپ بات بڑی اہم ہے کہ جانور اپنے

جواہر لال نہرو کی اور کتابوں کی طرح پیش نظر کتاب بھی دنیا کی تقریباً سب ہی زبانوں میں شایع ہوچکی ہے۔ انگریزی اور ہندی میں تو اس کے بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ایک زمانے میں کتابستان (الہ آباد) اور مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) نے اس کا اُردو ترجمہ شایع کیا تھا۔ لیکن اب ان دونوں اداروں کی کتابیں بازار میں یک سر نایاب اور کتب خانوں میں کم یاب ہیں۔

کتابستان کا شایع کردہ ترجمہ جگہ جگہ اصل سے بہت ہٹا ہوا ہے، ممکن ہے کہ اس میں خود مصنف کی ترمیموں کو دخل ہو۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مجموعے کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ایک خط زاید ہے، جو انگریزی کتاب میں نہیں ہے۔ اسے جوں کا توں، ضمیمہ میں، شامل کر دیا گیا ہے۔

عتیق صدیقی

۱۹ دسمبر ۱۹۶۹ء
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً تمام جانور اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن جو اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے اور ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں ان کے زندہ رہنے کے امکانات زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ چناں چہ ایسی ہی جانوروں کی تعداد بڑھتی ہے باقی کی نہیں بڑھتی۔ اس سے بہت سی باتوں کا پتا چلتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادنا قسم کے جان دار کس طرح ترقی کر کے اعلا قسم کے جان دار بنے، ممکن ہے انھیں میں سے کچھ لکھوکھا برس کی ترقی کے بعد آدمی بنے ہوں۔ یہ تبدیلیاں اپنے گرد و پیش رونما ہوتے ہوئے ہم نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ ان تبدیلیوں کی رفتار بہت سُست اور ہماری عمر بہت کم ہوتی ہے، لیکن قدرت کا عمل جاری رہتا ہے۔ وہ چیزوں کو بدلتی اور بہتر بناتی رہی ہے۔ قدرت ٹھہرنا یا آرام کرنا نہیں جانتی۔

یہ تو تم کو یاد ہی ہوگا کہ زمین رفتہ رفتہ ٹھنڈی اور دھیرے دھیرے خشک ہو رہی تھی، جب یہ اور ٹھنڈی ہوئی تو آب و ہوا بدلی اور ساتھ ہی بہت سی چیزیں بدلیں۔ زمین کی حالت بدلتے ہی جانوروں میں بھی آہستہ آہستہ تبدیلی آئی، اور نئے نئے قسم کے جانور بھی پیدا ہو گئے۔

بالکل شروع میں تو صرف سمندری جان دار ہی تھے، پھر ان سے پیچیدہ تر جانور پیدا ہوئے۔ آگے چل کر جب زیادہ زمین خشک ہوئی تو ایسے جانوروں نے جنم لیا جو خشکی پر بھی رہ سکتے تھے اور تری میں بھی۔ یہ آج کے گھڑیال اور مینڈھک جیسے جانور ہوتے تھے، پھر ایسے جانور پیدا ہوئے جو صرف خشکی ہی پر رہ سکتے تھے۔ ان کے بعد پرندے آئے جو ہوا میں اُڑ بھی سکتے تھے۔

میں نے ابھی ابھی مینڈھک کا ذکر کیا تھا۔ اس کا مطالعہ بڑا دل چسپ ہے، کیوں کہ خود اسی کی زندگی سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ پانی کے جانور خشکی کے جانور کیوں کر بنے۔ مینڈھک شروع میں مچھلی ہوتا ہے اور بعد میں یہ خشکی کا جانور بن جاتا ہے۔ اور خشکی کے دوسرے جانوروں کی طرح اپنے پھیپھڑوں سے سانس لیتا ہے۔

اس پُرانے زمانے میں جب زمین پر زندگی شروع ہوئی تو بڑے بڑے جنگل تھے، یقیناً زمین پر دلدل ہی دلدل رہے ہوں گے ــ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے دلدل۔ بعد میں یہ جنگل کی مٹی سے ڈھک گئے اور چٹانوں اور مٹی کے دباؤ سے رفتہ رفتہ کوئلے میں تبدیل ہو گئے۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ کوئلہ کانوں سے نکالا جاتا ہے

جو زمین کے نیچے بڑی گہرائی میں ہوتی ہیں۔ یہ کانیں دراصل وہی پُرانے زمانے کے جنگل ہیں۔

خشکی کے پہلے جانوروں میں بڑے بڑے سانپ چھپکلیاں اور گھڑیال تھے۔ ان میں سے بعض تو سو سو فٹ لمبے ہوتے تھے۔ ذرا ایک سو فٹ لمبے سانپ یا چھپکلی کا تصوّر کرو! تمھیں یاد ہے کہ ان جانوروں کے فاسل تم نے لندن کے میوزیم میں دیکھے تھے۔

آگے چل کر وہ جانور آئے جو آج کل کے اُن جانوروں سے زیادہ ملتے جلتے تھے، جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ انھیں میمل[1] یا تھن دار جانور کہتے ہیں، کیوں کہ یہ اپنے بچّوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ یہ جانور اب کے جانوروں سے بہت بڑے ہوتے تھے۔ آدمی سے سب سے زیادہ ملتا جلتا میمل بندر، بلکہ بن مانس، ہے۔ اسی لیے لوگوں کا خیال ہے کہ انسان بن مانس ہی کی اولاد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر جان دار نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بناکر خود کو بہتر سے بہتر

۱۔ میمل (Mammals) ان جانوروں کو کہتے ہیں جو اپنے بچوں کو دودھ پلاکر پرورش کرتے ہیں۔

بنایا ہے، اسی طرح انسان بھی شروع میں ایک اچھا خاصا بن مانس رہا ہوگا، خود کو برابر بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہا، یا یوں کہو کہ قدرت اس کو سنوارنے کی کوشش کرتی رہی۔ آج تو آدمی اپنی کوئی انتہا سمجھتا ہی نہیں، اور خود کو جانوروں سے بالکل ہی مختلف جانتا ہے، لیکن اچھا ہے اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ ہم بندروں اور بن مانسوں کے بھائی بند ہیں، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آج بھی ہم میں سے بہت سے لوگ بندروں ہی جیسی حرکت کرتے ہیں۔

★

انسان کی آمد

پچھلے خط میں ہم نے پڑھا ہے کہ زمین پر زندگی کتنے سیدھے سادھے طریقے سے پیدا ہوئی، اور پھر لاکھوں برسوں میں وہ شکل اس نے اختیار کی، جس شکل میں آج ہمیں نظر آتی ہے۔ یہ اہم اور دل چسپ بات بھی ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جان دار جب ترقی کرنے لگے تو گرد و پیش کے حالات کے سانچوں میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی انھوں نے کوشش کی۔ اس کوشش کے نتیجے میں بہت سی نئی چیزیں ان کے اندر پیدا ہوئیں، وہ ترقی یافتہ بنے اور ان کی بناوٹ بھی پیچیدہ ہوگئی۔ ان کی یہ ترقی و تبدیلی کئی طرح سے ہمیں نظر آسکتی ہے۔ مثلاً شروع کے دور میں جانوروں کے ہڈیاں نہیں تھیں، اور اس کمی کی وجہ سے بہت دنوں تک وہ زندہ نہیں رہتے تھے، چناں چہ انھوں نے اپنے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ سب سے پہلے جو ہڈی ان کے اندر پیدا ہوئی، وہ

ریڑھ کی ہڈی تھی۔ اس طرح سے جانوروں میں دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک قسم ہڈی والے جانوروں کی اور دوسری بے ہڈی والوں کی۔ آدمی، اور وہ جانور بھی جو تم کو اِدھر اُدھر نظر آتے ہیں، ان کے یقیناً ہڈیاں ہوتی ہیں۔

کچھ بھولے بھالے جانور بھی ہیں، جیسے مچھلی، جو انڈے دے کر چھوڑ دیتی ہے۔ ایک مرتبہ میں وہ ہزاروں انڈے دیتی ہے، لیکن وہ ان کی دیکھ ریکھ بالکل نہیں کرتی۔ ماں کو اپنے بچوں کی بالکل فکر نہیں ہوتی۔ وہ تو بس انڈے دے کر چھوڑ دیتی ہے، اور پھر ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی۔ ان انڈوں کی دیکھ بھال کرنے والا چوں کہ کوئی نہیں ہوتا، اس لیے ان میں بہت سے انڈے گندے ہو کر مُردہ ہو جاتے ہیں، اور بہت کم مچھلی بن پاتے ہیں۔ کتنا بھاری نقصان ہوتا ہے اس طرح سے! جب ان سے بہتر قسم کے جانوروں کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انڈے بچے تو کم ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے بچوں کی دیکھ بھال وہ بہتر طریقے سے کرتے ہیں۔

مُرغی بھی انڈے دیتی ہے، لیکن وہ اپنے انڈوں کو سیتی بھی ہے، اور جب انڈوں سے بچے نکلتے ہیں،

تو وہ کچھ دنوں تک انھیں چگاتی بھی ہے، جب وہ بڑے ہوجاتے ہیں تو پھر ماں ان کی زیادہ فکر نہیں کرتی۔

اعلا قسم کے، دودھ دینے والے، جانوروں میں بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں، اپنے پچھلے خط میں، تمھیں کچھ بتلایا بھی تھا۔ یہ جانور — جیسے کتے، بلّی، اور خرگوش وغیرہ، انڈے دیتے نہیں ہیں، بلکہ مائیں انڈے اپنے اندر ہی رکھتی ہیں اور پھر بنا بنایا بچہ ان کے پیٹ سے نکلتا ہے، اور ماں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتی ہے، لیکن پھر بھی بہت سے بچّے ضایع جاتے ہیں۔ مثلاً ہر چند مہینوں کے بعد خرگوش کے بہت سے بچے پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے بہت سے مر بھی جاتے ہیں، لیکن زیادہ ترقی یافتہ جانوروں — جیسے ہاتھی کے ایک ہی بچہ ہوتا ہے، اور ماں اپنے بچے کی بہت اچھی طرح پرورش کرتی ہے۔

اس طرح سے انسان نے، ابتدائی دور میں، یقیناً ادنا قسم کے جانوروں سے ترقی کرنی شروع کی ہوگی۔ ابتدائی دور کے آدمی شاید اس شکل کے مشکل ہی سے رہے ہوں گے، جس طرح کے آج ہمیں نظر آتے ہیں۔ وہ یقیناً آدھے آدمی اور آدھے بن مانس رہے ہوں گے اور کچھ بندروں

گلیشیر — برف کے پہاڑ

کی سی زندگی گزارتے رہے ہوں گے۔ تمھیں یاد ہو گا کہ ہائی ڈِل برگ، جرمنی، میں ہم لوگوں کے ساتھ تم بھی ایک پروفیسر سے ملنے گئی تھیں۔ ایک چھوٹے سے عجائب خانے کی اس نے ہمیں سیر بھی کرائی تھی، جس میں بہت سے فاسل رکھے تھے، اور ایک پُرانی کھوپڑی بھی تھی، جسے وہ بڑی احتیاط سے لوہے کی الماری میں مقفّل رکھتا تھا۔ اس کھوپڑی کے بارے میں خیال تھا کہ وہ کسی ابتدائی دور کے آدمی کی ہے۔ اب ہم اسے ہائی ڈل برگ کے آدمی کی کھوپڑی کہتے ہیں، کیوں کہ وہ ہائی ڈل برگ ہی کے قریب زمین میں دفن پائی گئی تھی۔ لیکن اس زمانے میں نہ تو ہائی ڈل برگ تھا اور نہ کوئی اور شہر۔

اس ابتدائی زمانے میں جب پہلے آدمی اِدھر اُدھر گھوما پھرا کرتے تھے، اس وقت بڑی سردی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کو "برف کا زمانہ" کہتے ہیں، کیوں کہ اس وقت برف بہت زیادہ تھی۔ برف کے بڑے بڑے پہاڑ، جیسے آج کل قطب شمالی میں پائے جاتے ہیں، انگلستان اور جرمنی تک پھیلے تھے۔ آدمی کے لیے اس سردی میں رہنا بڑا مشکل رہا ہو گا، اور زندگی بڑی سخت رہی ہو گی، اور وہ صرف ان ہی جگہوں پر رہ سکتے ہوں گے، جہاں برف

کے پہاڑ نہ ہوتے ہوں گے۔ سائنس جاننے والوں کا کہنا ہے کہ اس دور میں بحر روم سمندر نہیں تھا، بلکہ اس جگہ صرف دو ایک جھیلیں تھیں۔ اور بحر احمر کا بھی کوئی وجود نہ تھا، بلکہ جہاں آج سمندر ہے وہاں خشکی تھی، بلکہ خود ہندستان کا بیش تر حصہ شاید ایک جزیرہ تھا، جہاں پنجاب ہے، وہاں سمندر تھا۔ اور ہمارے صوبے[1] کا بھی یہی حال تھا۔ ذرا سوچو تو کہ پورا دکھن بھارت اور مدھ بھارت جزیرہ رہا ہوگا، اور اس جزیرے اور ہمالہ پہاڑ کے درمیان سمندر حایل رہا ہوگا۔ تم اس زمانے میں ہوتیں تو مسوری[2] پہاڑ جانے کے لیے تمھیں جہاز سے جانا پڑتا۔

آدمی جب وجود میں آیا تو اس وقت تو اس کے چاروں طرف بہت سے بڑے بڑے جانور رہے ہوں گے، اور وہ بہت ڈرتا رہا ہوگا۔ لیکن اب تو آدمی ہی دُنیا کا مالک ہے، اور جانوروں سے جو کام چاہتا ہے، لیتا ہے۔ گھوڑے، گائے، ہاتھی، کتّے اور بلی جیسے بہت سے جانوروں کو تو وہ پالتو بنالیتا ہے۔ کچھ جانوروں کو وہ کھاتا

۱۔ اتر پردیش۔

۲۔ اس زمانے میں اندیرا مسوری پہاڑ ہی پر تھیں۔

اِندیرا ماں اور باپ کے ساتھ

ہے، اور شیر اور چیتے جیسے کچھ جانوروں کا تو تقریباً وہ شکار کرتا ہے۔ لیکن اُس ابتدائی زمانے میں وہ آقا نہیں تھا، بلکہ بڑے بڑے جانوروں سے وہ خود اپنی جان بچاتا پھرتا رہا ہوگا۔ بہرکیف آہستہ آہستہ آدمی نے ترقی کی اور مضبوط سے مضبوط تر بنتے بنتے تمام جانوروں سے زیادہ طاقت ور بن گیا۔ یہ کارنامہ اس نے کیوں کر انجام دیا؟ طاقت کے بل پر یہ درجہ اس نے حاصل نہیں کیا، کیوں کہ ہاتھی آج بھی آدمی سے زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ یہ کارنامہ تو اس نے عقل اور ذہانت سے انجام دیا۔

ابتدا سے لے کر اس وقت تک انسانی ذہن نے جو ترقی کی ہے، ہم چاہیں تو اس کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ دراصل ذہانت ہی ہے جو انسان کو جانوروں سے جُدا کرتی ہے۔ ایک بے عقل آدمی اور جانور میں عملاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔

انسان کی پہلی عظیم دریافت غالباً آگ تھی۔ آج ہم دیاسلائی سے آگ جلاتے ہیں، مگر دیاسلائی تو آج کی چیز ہے۔ پرانے وقتوں میں تو پتھر کے دو ٹکڑوں کو آپس میں رگڑ کر چنگاری پیدا کی جاتی تھی، جو سوکھی گھاس پھوس یا کسی اور سوکھی چیز کو پکڑ لیتی تھی۔ اکثر جنگلوں میں پتھروں

کی رگڑ، یا کسی اور وجہ سے، خود بہ خود آگ لگ جاتی ہے۔ جانوروں میں تو اتنی عقل نہیں تھی کہ وہ اس تجربے سے فایدہ اٹھاتے، لیکن انسان میں عقل تھی، اور آگ کے فایدے اس کی سمجھ میں آگئے۔ سردیوں میں آگ اُسے گرم رکھ سکتی تھی، اور اس کے دشمن، بڑے بڑے جانوروں کو، خوف زدہ کرکے بھگا سکتی تھی۔ چناں چہ جب کبھی بھی آگ لگی ہوگی، تو مردوں اور عورتوں نے اس پر سوکھے پتّے ڈھیر کرکے اسے روشن رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ اسے بجھنے نہیں دینا چاہتے رہے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ دو پتھروں کی رگڑ سے وہ خود بھی چنگاری پیدا کرکے آگ جلا سکتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ایک عظیم دریافت تھی، اور اس کی وجہ سے انھیں جانوروں کے مقابلے میں فوقیت حاصل ہوئی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی انسان نے دنیا پر حکم رانی کرنے کی راہ پر گام زنی شروع کردی۔

ابتدائی زمانے کے انسان

پچھلے خط میں تم نے پڑھا ہے کہ آدمیوں اور دوسرے حیوانوں میں اصلی فرق بس یہ ہے کہ انسان کے عقل ہوتی ہے، جس سے دوسرے جانور محروم ہیں۔ اسی عقل نے انسان کو ان بڑے بڑے جانوروں سے زیادہ طاقت ور اور چالاک بنادیا، جو اسے زندہ ہی کھاجاتے، اگر اس کے پاس عقل نہ ہوتی۔ انسان میں جوں جوں عقل بڑھتی گئی، اس میں زیادہ طاقت بھی پیدا ہوگئی۔ شروع شروع میں تو اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے، وہ تو بس ان پر پتھر ہی پھینک سکتا تھا، پھر اسی پتھر سے اس نے کلاڑھی، بھالے وغیرہ کے علاوہ پتھر کی پتلی پتلی سوئیاں بھی بنانی شروع کیں۔ یہ سب سامان ہم نے لندن اور جنیوا کے عجائب گھروں میں دیکھے تھے۔

اپنے کسی پچھلے خط میں برف کے زمانے کا میں ذکر کرچکا ہوں۔ یہ زمانہ رفتہ رفتہ ختم ہوا، اور وسطی یورپ

اور ایشیا سے برف کے پہاڑ بھی غائب ہوگئے۔ اس طرح سردی جوں جوں کم ہوتی گئی، آدمی بھی مختلف حصوں میں پھیلنے لگے۔ ان دنوں میں گھر یا اور مکان نہیں ہوتے تھے، لوگ غاروں میں رہا کرتے تھے۔ کھیتی باڑی بھی نہیں ہوتی تھی۔ آدمی کا بس پھل پھلاری ہی پر، یا شکار کیے ہوئے جانوروں پر گزارا ہوتا تھا۔ روٹی یا چاول کا تو وہ نام بھی نہ جانتے تھے، کیوں کہ جوت بوکر پیدا کرنا تو انھیں آتا ہی نہیں تھا۔ پکانا بھی وہ جانتے نہیں تھے۔ ہاں شاید گوشت کو آگ دکھاکر سینک لیتے تھے۔ پکانے کے برتن اور ہانڈی کڑھائی بھی ان کے پاس نہ تھی۔

ایک عجیب سی بات یہ ہے کہ یہ وحشی انسان تصویریں بنانا جانتے تھے۔ کاغذ، قلم، پنسل یا برش تو ان کے پاس تھا نہیں، لیکن پتھر کی نوک دار سوئیاں اور دوسرے نوک دار اوزار ان کے پاس ضرور تھے۔ انھیں سے وہ اپنے غاروں کی دیواروں پر جانوروں کی تصویریں کھودتے تھے۔ ان میں سے بعض تصویریں خاصی اچھی، مگر یک رخی، ہوتی تھیں۔ یہ تو تم کو معلوم ہے کہ یک رخی تصویر بنانا زیادہ آسان ہے، اور بچے عموماً ایسی ہی تصویریں بناتے ہیں۔ غاروں میں چوں کہ اندھیرا ہوتا ہے، اس لیے

ہوسکتا ہے کہ معمولی سا چراغ بھی ان کے پاس رہا ہو۔

ابتدائی زمانے کے ان آدمیوں کو، جن کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے، 'قدیم پتھروں کے دور کے آدمی' کہا جاتا ہے، اور اس زمانے کو 'پتھر کا زمانہ' کہتے ہیں، کیوں کہ اس زمانے کے آدمی اپنے تمام اوزار پتھروں ہی سے بناتے تھے۔ دھات کا استعمال تو ان کو معلوم ہی نہیں تھا۔ آج کے زمانے میں جو چیزیں تم استعمال کرتی ہو، وہ دھات، خصوصاً لوہے، سے بنائی جاتی ہیں۔ اُس زمانے میں لوہے یا کانسے کی تو انھیں خبر ہی نہیں تھی، اس لیے وہ تو بس پتھر سے کام لیتے تھے، جس سے سامان تیار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پتھر کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے دُنیا کی آب و ہوا میں بھی بڑی تبدیلی آچکی تھی، اور یہ بہت گرم ہوگئی تھی۔ برف کے پہاڑ تو بہت پہلے ہی قطب شمالی کے سمندر میں جا چکے تھے، اور یورپ اور وسطی ایشیا میں بڑے بڑے جنگل اُگ آئے تھے۔ ان جنگلوں میں انسانوں کی ایک نئی نسل ہمیں ملتی ہے۔ یہ لوگ پتھر کے زمانے کے لوگوں سے، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بعض اعتبار سے زیادہ چالاک تھے، لیکن یہ لوگ بھی اپنے اوزار پتھروں ہی سے بناتے تھے۔ اس لیے

یہ لوگ بھی پتھر ہی کے زمانے کے انسان تھے لیکن ان کا زمانہ پتھر کے زمانے کا آخری دور تھا۔ اسی مناسبت سے انھیں 'نئے پتھر کے دور کے آدمی' کہا جاتا ہے۔

نئے پتھر کے زمانے کے آدمیوں کا جب ہم جایزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ خاصی ترقی کر چکے تھے۔ انسان کی ذہانت نے، اور دوسرے حیوانوں کے

مقابلے میں، اسے بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ 'نئے پتھر کے

دور کے آدمی، کی سب سے بڑی دریافت کھیتی باڑی کا طریقہ تھا۔ ان لوگوں نے جوتنا بونا اور اناج پیدا کرنا شروع کیا۔ یہ ان کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ جانوروں کا شکار کرنے کی زحمت کے مقابلے میں، اب انھیں زیادہ آسانی سے غذا مل جاتی تھی۔ آرام کرنے اور سوچنے کا بھی انھیں اب زیادہ موقع ملنے لگا۔ چناں چہ جتنی فرصت انھیں ملی، اسی قدر انھوں نے نئی نئی باتیں اور نئے نئے طریقے دریافت کیے۔ مٹی کے برتن بنانا انھوں نے شروع کیا، اور اسی میں اپنا کھانا پکانے لگے۔ ان کے پتھر کے اوزار اب پہلے سے بہتر اور چمک دار ہونے لگے، اور گائے، بکری، بھیڑ اور کتے جیسے جانوروں کو پالتو بنانے کا ڈھنگ بھی انھیں آچکا تھا، اور کپڑا بھی وہ بُننے لگے تھے۔

یہ لوگ جھونپڑوں یا مکانوں میں رہتے تھے، جو عموماً جھیلوں کے بیچ میں اس لیے بنائے جاتے تھے، تاکہ جانور یا دوسرے آدمی آسانی سے ان پر حملہ نہ کرسکیں۔ جھیل کے اندر رہنے کی مناسبت سے ان لوگوں کو 'جھیل باسی' کہا جاتا ہے۔

تمھیں یہ سوچ کر حیرت ہوگی کہ اس زمانے کے

لوگوں کا حال ہمیں کیوں کر معلوم ہوا! وہ لوگ کوئی کتاب لکھ کر تو چھوڑ نہیں گئے تھے، جس سے اس زمانے کی باتیں ہمیں معلوم ہوتیں۔ لیکن یہ تو میں پہلے ہی تمھیں بتا چکا ہوں کہ اس دور کے انسانوں کی داستان۔ جس کتاب میں ہمیں ملتی ہے، وہ خود قدرت کی عظیم کتاب ہے۔ مگر اس کا پڑھنا آسان نہیں ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش میں بہتوں نے اپنی عمریں کھپائی ہیں۔ انھوں نے بہت سے فاسل اور اس زمانے کی اور بہت سی چیزیں بھی جمع کی ہیں۔ یہ فاسل بڑے بڑے عجائب گھروں میں رکھے جاتے ہیں، اور وہاں 'نئے پتھر کے دور' کے آدمیوں کی بنائی ہوئی چمک دار کلہاڑیاں، برتن باسن کے علاوہ پتھر ہی کے تیر، سوئی اور دوسری بہت سی چیزیں بھی ہمیں ملیں گی۔ ان میں سے بہت سی چیزیں تو تم نے خود بھی دیکھی ہیں، لیکن یہ تمھیں شاید یاد نہ ہوں گی۔ اب اگر تم انھیں پھر دیکھو تو شاید زیادہ اچھی طرح سمجھ سکو گی۔

مجھے یاد آتا ہے کہ جینوا کے عجائب گھر میں ان

جھیل باسیوں کے مکانوں کا ایک اچھا نمونہ بھی تھا۔ جھیل میں لکڑی کی بلّیوں کو گاڑ کر، ان کے اُوپر لکڑی ہی کا ایک چبوترہ بنایا گیا تھا، اور اس چبوترے پر لکڑی ہی کے بنے ہوئے جھونپڑے تھے۔ ایک چھوٹا سا پُل بنا کر اس چبوترے کو خشکی سے ملا دیا گیا تھا۔

جھیل باسیوں کے گھر

نئے پتھر کے دور کے انسان، جانوروں کی کھال سے اپنے بدن بھی ڈھانکتے تھے، اور کبھی کبھی سَن کے بنے ہوئے موٹے سے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ سن کا ایک پودا ہوتا ہے۔ اس کے بہت نفیس تار ہوتے ہیں، جس سے کپڑے بُنے جاتے ہیں۔ آج کل تو اس سے بڑے باریک کپڑے بھی تیار کیے جاتے ہیں، لیکن اُس زمانے میں سن کے کپڑے بہت موٹے ہوتے

رہے ہوں گے۔

یہ لوگ مسلسل ترقی کرتے رہے۔ انھوں نے تانبے اور کانسے کے اوزار بنانا شروع کیا۔ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ تانبہ اور دوسری دھاتوں کو ملاکر کانسہ بنایا جاتا ہے، اور یہ ان سب دھاتوں سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ سونے کو بھی یہ کام میں لاتے تھے، اور اتنے شوقین تھے کہ سونے کے زیور بھی بناتے تھے۔

یہ لوگ شاید آج سے کوئی دس ہزار برس پہلے رہے ہوں گے، لیکن یہ بھی صرف قیاس سے کہا جاتا ہے، ان کا صحیح زمانہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ تم نے غور کیا ہوگا کہ ابھی تک تو ہم لاکھوں برس پہلے کی باتیں کر رہے تھے، لیکن اب ہم آہستہ آہستہ اپنے زمانے سے قریب آتے جا رہے ہیں۔ نئے پتھر کے دور سے لے کر موجودہ دور تک کے انسان اگرچہ ایک کڑی سے جُڑے ہیں، اور ان میں یکایک کوئی تبدیلی بھی نہیں ہوئی ہے، تاہم ان سے ہم بہت مختلف ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی، قدرت کے قانون کے مطابق، آہستہ آہستہ عمل میں آئی ہے۔ انسانوں کی بہت سی قومیں بنیں، اور ہر قوم کے اپنے اپنے طور طریقے تھے، اور وہ اپنے

اِندیرا کے نام

جن کو یہ خط لکھے گئے تھے

اپنے ڈھنگ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ دُنیا کے مختلف حصوں کی آب و ہوائیں بھی مختلف تھیں۔ انسانوں نے ہر ہر جگہ کی آب و ہوا کے سانچوں میں اپنی زندگی کو ڈھالا اور ان میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ لیکن ان سب باتوں کے بارے میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

آج بس ایک بات اور تمھیں بتانا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ 'نئے پتھر کا زمانہ' جب ختم ہونے کو آیا، تو اس وقت انسان پر ایک بڑی آفت آئی۔ یہ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ اس زمانے میں بحر روم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس جگہ تو بس کچھ جھیلیں تھیں، اور بہت سے لوگ ان ہی جھیلوں میں رہتے تھے۔ یکایک ایسا ہوا کہ یورپ اور افریقہ کے بیچ میں، جبرالٹر (جبلِ طارق) کے قریب زمین غائب ہوگئی، بحر اٹلانٹک کا پانی بحر روم کی نشیبی وادی میں بھر گیا، اور یہ بڑھتا ہی رہا۔ ان جھیلوں میں یا اس کے ارد گرد بسنے والے بہت سے مرد اور عورتیں اس سیلاب میں ڈوب گئی ہوں گی۔ وہ کسی طرح بچ ہی نہیں سکتے تھے، کیوں کہ سیکڑوں میل تک پانی ہی پانی تھا۔ بحر اٹلانٹک کا یہ سیلاب بڑھتا ہی رہا، یہاں تک

کہ پوری وادی جل تھل ہوگئی، اور بحر روم وجود میں آ گیا۔
اس عظیم سیلاب کے بارے میں تم نے یقیناً سنا ہوگا، اور شاید پڑھا بھی ہو۔ انجیل میں اس کا بیان موجود ہے، اور ہماری سنسکرت کی بعض کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی عظیم سیلاب نے بحر روم کو لبریز کر دیا ہو۔ یہ اتنی بڑی تباہی تھی کہ بہت کم لوگ اس سے بچے ہوں گے۔ انھوں نے اس بپتا کی داستان اپنے بچوں کو سنائی ہوگی، جنھوں نے اسے یاد رکھا ہوگا اور اپنی اولادوں کو سنائی ہوگی۔ اس طرح سے یہ داستان سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہی۔

*

نئے پتھر کے دور کا ایک برتن

مُختلف نسلیں کیوں کر بنیں؟

پچھلے خط میں 'نئے' پتھر کے زمانے' کے اُن آدمیوں کے حالات ہم نے بیان کیے تھے، جو جھیل باسی تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان لوگوں نے خاصی ترقی کی تھی۔ کھیتی باڑی کا اور پکانے کا طریقہ انھوں نے دریافت کر لیا تھا، اور اپنے کام کاج کے لیے جانوروں کا پالنا بھی انھیں آگیا تھا۔ یہ سب ہزاروں برس پرانی باتیں ہیں، جن کے متعلق ہماری معلومات بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن آج دُنیا میں جتنی بھی نسلیں پائی جاتی ہیں، وہ شاید ان ہی 'نئے پتھر کے عہد' ہی کے انسانوں کی نسلیں ہیں۔ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ آج دنیا میں سفید، زرد، بھورے اور کالے رنگ کے آدمی ہمیں نظر آتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ انسانی نسلوں کو ان چار رنگوں ہی میں تقسیم کر دینا آسان نہیں ہے۔ یہ انسانی نسلیں اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ

کسی کے بارے میں بھی مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً کس نسل سے اس کا تعلق ہے۔ ہاں نسلوں کی سائنس (علم) جاننے والے کھوپڑیوں کو ناپ کر اکثر بتا دیتے ہیں کہ فلاں کھوپڑی فلاں نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بات کے دریافت کرنے کے اور کچھ طریقے بھی ہیں۔

یہ تمام مختلف نسلیں کیوں کر وجود میں آئیں؟ اگر یہ سب ایک ہی باوا آدم کی اولاد ہیں، تو پھر یہ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف کیوں ہیں؟ یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ ایک جرمن ایک حبشی سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک چینی ان دونوں سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ یہ بتلانا تو مشکل ہے کہ ایک ہی نسل کے لوگوں میں یہ فرق کیوں کر پیدا ہوا، لیکن اس کے بعض اسباب کا ہمیں علم ہے۔

یہ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ جانوروں میں کیوں کر آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا ہوئی، جب انھوں نے اپنے آپ کو اپنے ماحول کے سانچوں میں ڈھالا۔ ہوسکتا ہے کہ جرمن اور حبشی مختلف قسم کے انسانوں کی اولاد ہوں، لیکن کبھی نہ کبھی تو دونوں کے جد ایک ہی

رہے ہوں گے۔ چناں چہ یہ فرق جو ہمیں نظر آتا ہے، وہ مختلف ماحولوں میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کا یقیناً نتیجہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے مقابلے میں، بعض جانوروں کی طرح، زیادہ آسانی سے اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھال سکے ہوں۔

بہت دور انتہائی سرد اور برفانی علاقے کا رہنے والا سردی برداشت کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرے گا۔ اسکیمو تو آج بھی شمال کے برفانی میدانوں میں رہتے ہیں اور وہ شدید سردی برداشت کر سکتے ہیں۔ ہمارے جیسے گرم ملک میں اگر انھیں لے آیا جائے تو وہ شاید مر ہی جائیں۔ یہ لوگ باقی دُنیا سے چوں کہ کٹ گئے ہیں، اور انھیں بڑی مشقت کی زندگی گزارنی پڑتی ہے، اس لیے وہ اتنی باتیں سیکھ بھی نہیں سکے، جتنی کہ دنیا کے دوسرے حصوں کے رہنے والوں نے سیکھ لی ہیں۔ افریقہ یا خط استوا کے قریب رہنے والے گرمی برداشت کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں، کیوں کہ وہاں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ سورج کی گرمی کی شدت سے کالے ہوجاتے ہیں۔ یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ دھوپ میں سمندر

کے کنارے، یا کسی اور جگہ، تم اگر زیادہ وقت تک رہو تو تمھارا رنگ سانولا یا سیاہی مایل ہوجائے گا۔ چند ہفتوں تک دھوپ میں گزارنے کے بعد اگر تمھارا رنگ بدل کر سانولا ہوسکتا ہے، تو پھر اس آدمی کا رنگ تو اور زیادہ سیاہی مایل ہو ہی جائے گا، جو زندگی بھر دھوپ میں رہا ہو۔ اور جو سیکڑوں برس سے، بلکہ پشتہا پشت سے، گرم ملکوں میں رہتے آئے ہوں، ان کے رنگ تو سیاہی مایل ہوتے ہوتے بالکل کالے ہو ہی جائیں گے۔ ہندستانی کسان کو تم نے گرمی کی دوپہر میں کھیت میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ چوں کہ وہ بہت غریب ہوتا ہے اس لیے اس کے پاس زیادہ کپڑے بھی نہیں ہوتے۔ اس کا پورا جسم دھوپ میں جھلستا رہتا ہے۔ اس کی پوری زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ اس کا سیاہی مایل ہونا لازمی ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آدمیوں کا رنگ اس آب و ہوا پر منحصر ہوتا ہے، جس میں وہ رہتے ہیں۔ اس کا تعلق انسان کی اچھائی یا خوب صورتی سے نہیں ہے۔ سفید فام آدمی اگر کسی گرم ملک میں بہت

دنوں تک آگر رہے، اور اس کے پاس گرمی سے بچنے کے لیے خس کی ٹٹیاں اور پنکھے نہ ہوں، تو اس کا رنگ بھی سیاہی مایل ہوجائے گا۔ تمھیں معلوم ہے کہ ہم کشمیری ہیں، اور دوسو سال پہلے ہمارے اجداد کشمیر میں رہتے تھے۔ کشمیر میں تمھیں ہرآدمی، یہاں تک کہ مزدور اور کسان بھی، گورے ہی ملیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کشمیر کی آب و ہوا سرد ہے۔ لیکن یہی کشمیری جب کشمیر سے نکل کر ہندستان کے دوسرے حصوں میں آجاتے ہیں، جو گرم ہوتے ہیں، تو چند نسلوں کے بعد ان کا رنگ بھی سانولا سا ہوجاتا ہے۔

ہاں تو رنگ اس آب و ہوا پر منحصر ہوتا ہے، جس میں وہ رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ گرم ملک میں رہتے ہوں، اور وہ اتنے امیر ہوں کہ انھیں دھوپ میں کام نہ کرنا پڑتا ہو اور ان کے پاس عالی شان مکان ہوں اور اپنی تندرستی اور اپنے رنگ کی دیکھ بھال کر سکتے ہوں۔ ایسے امیر خاندانوں کے رنگ پر، پشتہاپشت تک رہنے کے باوجود، آب وہوا بہت زیادہ اثرانداز نہیں ہوسکتی۔ لیکن خود کام نہ کرنا اور دوسروں کی محنت پر زندہ رہنا کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

تم دیکھو گی کہ کشمیر اور پنجاب میں، جو شمالی ہند میں ہیں، عام طور پر لوگوں کا رنگ صاف ہوتا ہے، لیکن اگر تم جنوب میں جاؤ تو وہاں کے رہنے والوں کے رنگ سیاہی مایل پاؤ گی۔ مدراس اور لنکا میں، تم نے خود دیکھا ہے، لوگ خاصے کالے ہوتے ہیں۔ تم اس کا سبب یقیناً آب و ہوا ہی کو قرار دو گی، اور کہو گی کہ یہ علاقے خط استوا سے چوں کہ قریب ہیں، اس لیے وہاں گرمی بہت ہوتی ہے۔ تمھارا یہ جواب بالکل صحیح ہوگا، اور ہندستان کے مختلف حصوں میں مختلف رنگوں کے پائے جانے کا یہی سبب ہے۔ آگے چل کر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ہندستان میں رنگوں کے فرق کا تھوڑا بہت سبب یہ بھی ہے کہ یہاں جو لوگ باہر سے آئے، وہ مختلف نسلوں کے تھے۔ پچھلے زمانے میں بہت سی نسلوں کے لوگ ہندستان آئے، ایک زمانے تک انھوں نے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کی، لیکن پھر انھیں ایک دوسرے سے گھلنا ملنا ہی پڑا۔ چناں چہ اب یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ فلاں ہندستانی فلاں نسل کا ہے۔

*

انسانی نسلیں اور زبانیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسان سب سے پہلے دُنیا کے کس حصے میں پیدا ہوا، اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ ابتدائی انسانی بستیاں دنیا کے کس حصے میں بسیں۔ غالباً دنیا کے مختلف حصوں میں، اور کم و بیش ایک ہی وقت میں انسان پیدا ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ 'برف کے عہد' کے برفانی پہاڑ جب پگھل کر شمال کی طرف بہنے لگے ہوں، تو انسان اس وقت نسبتاً گرم علاقوں میں آباد رہے ہوں۔ برف کے پگھلنے کے بعد یقیناً اسی طرح کے میدان رہ گئے ہوں گے، جیسے کہ آج سائبیریا میں چٹیل میدان ملتے ہیں۔ پھر ان میدانوں میں گھاس اُگ آئی ہوگی، اور اپنے مویشیوں کے لیے چارے کی تلاش میں انسان ان میدانوں میں گھومتے رہے ہوں گے۔ وہ لوگ جن کے رہنے کی کوئی جگہ مقرر نہیں ہوتی اور جو ہمیشہ

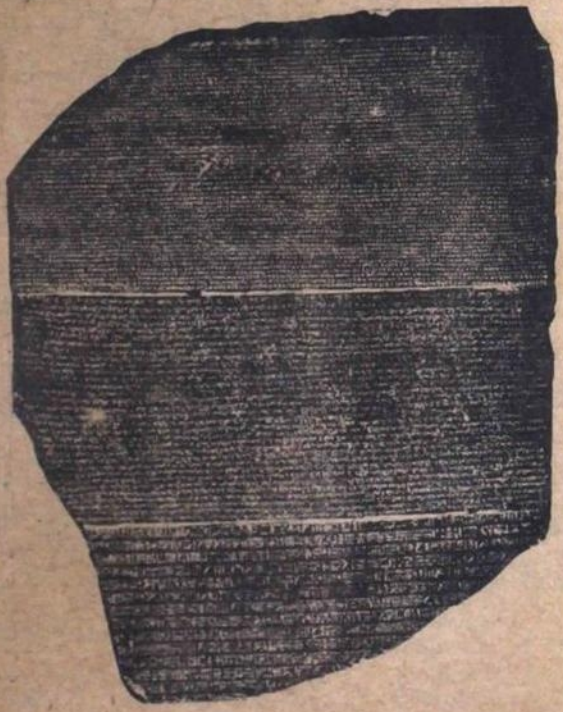

یہ پتھر کے تین الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ ان میں سے ایک
قدیم یونانی زبان کا اور دو قدیم مصری زبان کے کتبے ہیں۔

فہرست

دیباچہ

دیباچہ (طبع دوم)

۱	قدرت کی کتاب	۱۷
۲	ابتدائی تاریخ لکھی کیسی گئی	۲۵
۳	یہ دُنیا بنی کیسے؟	۳۳
۴	پہلی جان دار چیزیں	۳۹
۵	جانوروں کا آنا	۴۹
۶	انسان کی آمد	۵۵
۷	ابتدائی زمانے کے انسان	۶۳
۸	مختلف نسلیں کیوں کر بنیں	۷۳
۹	انسانی نسلیں اور زبانیں	۷۹
۱۰	زبانوں کے باہمی رشتے	۸۹
۱۱	تہذیب ہے کیا!	۹۵
۱۲	قبیلوں کا بننا	۹۹

اِدھر اُدھر پھرا کرتے ہیں، خانہ بدوش کہے جاتے ہیں۔ خود ہندستان میں، اور دُنیا کے دوسرے بہت سے ملکوں میں اس طرح کے خانہ بدوش آج بھی پائے جاتے ہیں۔

پہلے پہل لوگ بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے ہوں گے، کیوں کہ دریا کے کنارے کی زمین زرخیز اور کھیتی باڑی کے لیے موزوں ہوتی ہے، اور پانی کی کثرت کی وجہ سے اناج پیدا کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان میں گنگا اور سندھ جیسے بڑے دریاؤں کے کنارے؛ عراق میں دجلہ اور فرات کے کنارے؛ اور مصر میں نیل کے کنارے انسان پہلے پہل آباد ہوئے ہوں گے۔ چین میں بھی یہی ہوا ہوگا۔

ہندستان کی سب سے پرانی نسل، جس کا ہمیں کچھ حال معلوم ہے، وہ دراوڑ نسل ہے۔ پھر، جیسا کہ آگے چل کر ہمیں معلوم ہوگا، یہاں پہلے آریائی نسل کے لوگ آئے، اور ان کے بعد منگول آئے۔ جنوبی ہندستان میں رہنے والے بہت سے لوگ آج بھی دراوڑ نسل کے ہیں۔ شمالی ہندستان کے رہنے والوں کے

مقابلے میں ان کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ لوگ بہت عرصے سے یہاں رہتے آئے ہیں۔ یہ دراوڑ بہت ترقی یافتہ تھے، ان کی اپنی زبان تھی، اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ لیکن ذرا ٹھہرو! ہم بہت تیزی سے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔

ہاں تو اسی زمانے میں وسطی اور مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ میں ایک نئی نسل جنم لے رہی تھی، جسے آریائی نسل کہتے ہیں۔ 'آریا' کا لفظ سنسکرت زبان میں بھی ملتا ہے۔ اس کے معنی ہیں شریف یا اونچے خاندان کا آدمی۔ چوں کہ سنسکرت بھی آریائی لوگوں کی ایک زبان تھی، اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا شریف اور اعلا خاندان سمجھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی شیخی باز تھے، جیسے کہ آج کل لوگ ہیں۔ تم جانتی ہو کہ آج ایک انگریز یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں وہی سب کچھ ہے، اور فرانسیسی کو بھی یقین ہے کہ اسی کی دنیا میں سب سے بڑی قوم ہے۔ یہی حال جرمنی اور امریکا کے رہنے والوں کا بھی ہے۔

یہ آریائی لوگ شمالی ایشیا اور یورپ کے ہریالی والے میدانوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ لیکن جب ان کی آبادی بڑھی اور وہاں کی آب وہوا بھی خشک ہونے لگی اور ہریالی بھی ختم ہوئی تو کھانے پینے کے سامان میں بھی کمی پیدا ہوئی۔ چناں چہ غذا کی تلاش میں انھیں دنیا کے دوسرے حصوں کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ اب وہ سارے یورپ میں پھیلنے لگے۔ ان میں سے کچھ لوگ ہندستان، ایران اور عراق میں بھی پہنچے

یورپ، شمالی ہندستان، ایران اور عراق کے رہنے والے اگرچہ آج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، لیکن دراصل یہ سب ایک ہی آریائی نسل کے ہیں۔ مگر یہ سب پرانی، بہت پرانی، باتیں ہیں، اور اس وقت سے لے کر اب تک نہ جانے کیا کچھ ہوچکا ہے، اور تمام نسلیں بڑی حد تک ایک دوسرے میں خلط ملط ہوچکی ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج دنیا میں جتنی قومیں پائی جاتی ہیں اُن میں آریائی نسل سب سے پرانی نسل ہے۔

منگول ایک دوسری بڑی نسل ہے، جو مشرقی ایشیا — چین، جاپان، تبت، سیام اور برما

میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کو "زرد نسل کے لوگ" بھی کہا جاتا ہے، اور تم دیکھوگی کہ ان کے جبڑوں کی ہڈی عام طور پر اُبھری ہوئی اور ان کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں۔

افریقہ، اور کچھ دوسری جگھوں کے بھی، رہنے والے حبشی ہوتے ہیں۔ یہ سب نہ تو آریائی ہیں اور نہ منگول۔ ان کے رنگ بڑے کالے ہوتے ہیں۔

عربستان اور فلسطین کے رہنے والے — عرب اور یہودی ایک دوسری ہی نسل کے ہیں۔

یہ تمام نسلیں، ہزاروں برس کے عرصے میں، بہت سی چھوٹی چھوٹی نسلوں میں بٹ گئیں، اور آپس میں گڈمڈ بھی ہوئیں، لیکن ہمیں ابھی اس طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختلف نسلوں کو پہچاننے کا ایک اہم اور دل چسپ طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کی زبانوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ابتدائی زمانے میں ہر نسل کی اپنی ایک زبان تھی، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان زبانوں سے اور بہت سی زبانیں پیدا ہوگئیں۔ لیکن یہ سب کسی ایک ہی زبان کی پیداوار ہیں اور کسی ایک ہی زبان کے گھرانے سے

ان کا تعلق ہے۔ مختلف زبانوں کے مشترک الفاظ کو اگر ہم چُن لیں، تو ان کے باہمی رشتے کا ہمیں آسانی سے پتا چل سکتا ہے۔

آریائی نسل کے لوگ جب ایشیا اور یورپ میں پھیلے، تو ایک دوسرے کے ساتھ وہ تعلق قایم نہ رکھ سکے۔ اس زمانے میں نہ تو ریل تھی، نہ تار اور ڈاک خانے، اور کتابیں بھی نہیں تھیں۔ یہ آریائی گروہ جہاں جہاں بھی گئے، ایک ہی زبان مختلف طریقوں سے بولتے تھے، لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد، ہر گروہ کی زبان اپنی اصلی زبان سے، یا اپنی ہی جیسی دوسری زبانوں سے، بالکل مختلف ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں ہمیں اتنی زبانیں ملتی ہیں۔

ان تمام زبانوں کا اگر مطالعہ کیا جائے، تو یہ دل چسپ بات معلوم ہوگی کہ زبانوں کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ ہے، تاہم بنیادی زبانیں چند ہی ہیں۔ مثلاً آریائی نسل کے لوگ جہاں جہاں بھی گئے، وہاں کی زبانیں آریائی زبان کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ سنسکرت، لاطینی، یونانی، انگریزی، فرانسیسی،

جرمن، اطالوی اور دوسری بہت سی زبانیں ایک دوسرے کی بہنیں اور آریائی گھرانے کی زبانیں ہیں۔ خود ہمارے ملک کی بہت سی زبانیں — ہندی، اردو، بنگالی، مراٹھی اور گجراتی سنسکرت کی بیٹیاں ہیں، اس لیے یہ سب بھی آریائی گھرانے کے ہیں۔

زبانوں کا ایک بڑا کنبہ چینی زبان کا بھی ہے، جس میں چینی، برمی، تبتی اور سیامی زبانیں شامل ہیں۔ اسی طرح ایک تیسرا گھرانہ سامی زبان کا ہے، جس سے عربی وعبرانی زبانیں نکلی ہیں۔ بعض زبانیں جیسے جاپانی اور ترکی، جو ان تینوں میں سے کسی زبان کے گھرانے سے بھی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ جنوبی ہند کی بعض زبانیں، جیسے تامل، تلگو، ملیالی اور کنڑ کا بھی ان تینوں میں سے کسی زبان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جنوبی ہند کی یہ چاروں زبانیں دراوڑی کنبے کی ہیں، اور بڑی پرانی زبانیں ہیں۔

*

چینی زبان کی لکھاوٹ کا طریقہ

آریائی خاندان کی ایک زبان ۔ تبتی زبان کی لکھاوٹ کا ایک نمونہ

زبانوں کے باہمی رشتے

ہم نے دیکھا ہے کہ آریائی نسل کے لوگ بہت سے ملکوں میں پھیلے، اور جہاں کہیں بھی گئے، اپنی زبان کو، خواہ جو بھی رہی ہو، وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن آب و ہوا اور ماحول کے فرق نے آریائی نسل کے تمام گروہوں کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف بنادیا۔ ہر گروہ کی عادتیں اور طور طریقے اپنے اپنے ڈھنگ سے بدلتے رہے۔ اس زمانے میں سفر کرنا چوں کہ بہت دشوار تھا اس لیے الگ الگ ملکوں میں رہنے والے گروہوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ چناں چہ یہ تمام گروہ ایک دوسرے سے کٹ گئے۔ ایک ملک کے رہنے والوں نے اگر کوئی نئی بات دریافت کر لی تو دوسرے ملکوں میں رہنے والوں کو وہ اس کی خبر بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس طرح سے تبدیلیاں آتی رہیں اور

ایک آریائی گھرانا اتنے بہت سے گروہوں میں بٹ گیا، اور شاید یہ بات انھیں یاد بھی نہیں رہی کہ ان سب کا ایک ہی بڑے خاندان سے تعلق ہے۔ ان کی ایک زبان کی بہت سی زبانیں بن گئیں، جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔

لیکن یہ تمام زبانیں اگرچہ ایک دوسرے سے بہت مختلف معلوم ہوتی تھیں، تاہم ان کے بہت سے الفاظ مشترک تھے اور ان میں بہت کچھ یکسانیت بھی تھی۔ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد، آج بھی مختلف زبانوں میں مشترک الفاظ مل جاتے ہیں، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ تمام زبانیں ایک ہی رہی ہوں گی۔ تمھیں معلوم ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ آؤ اس بات کے جانچنے کے لیے انگریزی کے دو عام الفاظ ہم لے لیں — 'فادر' (Father) اور 'مدر' (Mother) تم جانتی ہو کہ ہندی اور سنسکرت میں ان ہی معنوں میں 'پتا' (पिता) اور 'ماتا' (माता) کے الفاظ ہیں۔ لاطینی میں اسی کو Pater اور Mater یونانی میں Pater اور Meter جرمن زبان میں Vater (فاتر) اور Mutter (موتر)؛ فرانسیسی میں Pere

۱۳	مذہب کی ابتدا، اور کام کی تقسیم	۱۰۵
۱۴	کھیتی باڑی سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں	۱۱۱
۱۵	شیخ قبیلے کا سردار کیسے بنا!	۱۱۷
۱۶	شیخ کی ترقی	۱۲۱
۱۷	شیخ بادشاہ بن بیٹھا!	۱۲۵
۱۸	ابتدائی دور کا تمدن	۱۳۱
۱۹	پرانی دنیا کے بڑے بڑے شہر	۱۳۹
۲۰	مصر اور کریٹ	۱۴۳
۲۱	چین اور ہندستان	۱۴۹
۲۲	سمندری سفر اور تجارت	۱۵۵
۲۳	زبان، رسم خط اور گنتی	۱۶۳
۲۴	لوگوں کے مختلف طبقے	۱۶۹
۲۵	بادشاہ، مندر اور پروہت	۱۷۳
۲۶	گزشتہ پر ایک نظر	۱۷۹
۲۷	فاسل اور کھنڈر	۱۸۳
۲۸	ہندستان میں آریوں کی آمد	۱۸۹
۲۹	ہندستان میں آریوں کا رہن سہن	۱۹۳
۳۰	رامائن اور مہابھارت	۱۹۹
۳۱	ایک اور خط	۲۰۵

اور Pater کہتے ہیں۔ یہی حال دوسری تمام زبانوں کا بھی ہے۔ یہ سب کیا ایک دوسرے سے بہت قریب نہیں ہوتے؟ یہ سب ایک ہی خاندان کے الفاظ، یا بھائی بہن ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک زبان کسی دوسری زبان کے الفاظ اپنے اندر لے لے۔ مثلاً ہندی نے بہت سے الفاظ انگریزی سے اور انگریزی نے بھی کچھ الفاظ ہندی سے لیے ہیں۔ لیکن 'فادر' اور 'مدر' جیسے الفاظ مانگے کے نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ جو الفاظ لیے جاتے ہیں، وہ تو بالکل نئے ہوتے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں جب لوگوں نے پہلے پہل ایک دوسرے سے بات چیت شروع کی ہوگی تو اس وقت ماں اور باپ تو تھے ہی اور ان کے لیے الفاظ بھی ضرور گڑھے گئے ہوں گے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مانگے کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ یہ سب تو ایک ہی باپ کی اولاد یا ایک ہی خاندان کے الفاظ ہیں۔ اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آج مختلف ملکوں میں، ایک دوسرے سے الگ تھلگ، رہنے والے لوگ، جو مختلف زبانیں بولتے ہیں، کسی زمانے میں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے رہے

ہوں گے۔

غور کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ زبانوں کا مطالعہ کتنا دل چسپ ہوتا ہے، اور اس سے کتنی ہی باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ تین چار زبانیں ہم اگر سیکھ لیں تو اور بہت سی زبانوں کا سیکھنا ہمارے لیے آسان ہوسکتا ہے۔

اس سے تمھیں یہ بھی پتا چلے گا کہ مختلف ملکوں میں، ایک دوسرے سے بہت دور رہنے کے باوجود کسی زمانے میں یہ سب لوگ ایک ہی رہے ہوں گے۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہم میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں اور ہم اپنی آپس کی پرانی رشتہ داری بھی بھول چکے ہیں۔ ہر ملک کے رہنے والے لوگ اپنے ہی کو سب سے اچھا اور سب سے زیادہ عقل مند اور دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ انگریز سمجھتے ہیں کہ وہ اور ان کا ملک ہی سب سے اچھا ہے؛ فرانسیسی کو فرانس پر اور ہر فرانسیسی چیز پر ناز ہے، جرمنی اور اٹلی والوں کا بھی اپنے ملک کے متعلق یہی خیال ہے؛ اور اکثر ہندستانی بھی سمجھتے ہیں کہ بہت سی باتوں میں ہندستان ہی دُنیا کا

سب سے اچھا ملک ہے۔ یہ ایک طرح کی غلط فہمی ہے۔ ہر شخص اپنے متعلق اور اپنے ملک ہی کے لیے اچھی باتیں سوچتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی ایسا نہیں ہے، جس میں کوئی نہ کوئی اچھی اور کوئی نہ کوئی بُری بات نہ ہو۔ اچھی بات ہمیں جہاں بھی نظر آئے، اسے اپنا لینا چاہیے، اور بُرای جہاں بھی نظر آئے، اسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں یقیناً اپنے ملک، ہندستان ہی سے زیادہ تعلق ہے۔ آج، بدقسمتی سے، اس کی حالت خراب ہے، اور یہاں زیادہ تر لوگ غریب اور پریشان حال ہیں۔ ان کی زندگی بے لطف ہے۔ ان کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے طریقے ہمیں ڈھونڈھنے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے طور طریقوں اور رسم و رواج میں جو اچھی باتیں ہیں، وہ باقی رہیں، اور جو برائیاں ہیں وہ دور کی جائیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی کوئی اچھی بات اگر ہمیں نظر آئے، تو اسے بھی اپنا لینا چاہیے۔

ہم ہندستانی ہیں ہمیں ہندستان ہی میں رہنا ہے اور اس کی ترقی کے لیے کوشش کرنا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ دنیا کے بڑے کنبے سے

بھی ہمارا تعلق ہے، اور دوسرے ملکوں میں رہنے والے لوگ بھی ہمارے ہی بھائی بہن ہیں۔ یہ کتنی اچھی بات ہوگی کہ دنیا میں بسنے والے تمام لوگ خوش اور مطمئن زندگی گزاریں۔ اس لیے ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ ساری دنیا کو ہم ایک ایسی جگہ بنادیں جہاں ہر شخص خوشی کی زندگی بسر کرسکے۔

*

تہذیب ہے کیا؟

اب میں ابتدائی زمانے کی تہذیب کے بارے میں کچھ تمھیں بتاؤں گا۔ لیکن یہ کہانی شروع کرنے سے پہلے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ تہذیب ہے کیا! اگر تم لغت دیکھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ مہذب بننے کے معنی ہیں اپنے کو بہتر بنانا، اچھا بنانا، اور وحشیانہ عادتیں چھوڑ کر اچھے ڈھنگ اختیار کرنا۔ یہ لفظ خاص طور سے پورے سماج یا لوگوں کے گروہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگوں کی وحشیانہ باتیں، جو جانوروں کی حرکتوں سے کچھ ہی بہتر ہوتی ہیں، وحشیانہ کہی جاتی ہیں۔ تہذیب اسی کی ضد ہے۔ وحشیانہ عادتوں سے ہم جس قدر دور ہوں گے، اسی قدر مُہذّب کہلائیں گے۔

لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں سماج یا فلاں آدمی مُہذّب ہے؟ یورپ میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ مہذب ہیں، اور ایشیا کے

رہنے والے بالکل وحشی ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے رہنے والوں کے مقابلے میں یورپ کے رہنے والے کپڑے زیادہ پہنتے ہیں؟ لیکن کپڑوں کا کم یا زیادہ پہننا تو آب و ہوا پر منحصر ہے۔ سرد آب و ہوا کے رہنے والے، گرم آب و ہوا کے رہنے والوں کے مقابلے میں، زیادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ جس آدمی کے پاس بندوق ہو وہ نہتھے آدمی سے زیادہ طاقت ور اور اس سے زیادہ مہذّب ہوگا؟ کم زور آدمی، خواہ زیادہ مہذّب ہو یا نہ ہو، لیکن بندوق کا نشانہ بننے کے ڈر سے، طاقت ور آدمی سے یہ کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا کہ وہ اُس سے کم مہذّب نہیں ہے۔

تمھیں معلوم ہے کہ چند ہی سال ہوئے ایک بڑی لڑائی ہوئی تھی[1]۔ دنیا کے بیش تر ملکوں نے اس لڑائی میں حصہ لیا تھا اور ان میں سے ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ اپنے مخالف ملکوں کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وہ مار ڈالیں۔ انگریز جرمنوں کو

۱۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم۔

مارنے کی انتھک کوشش کر رہے تھے، اور جرمن انگریزوں کو۔ اس لڑائی میں لکھوکھا آدمی مارے گئے اور ہزارہا آدمی لولھے لنگڑے ہو گئے؛ بہتوں کی آنکھیں جاتی رہیں اور وہ اندھے ہو گئے؛ اور کتنوں ہی کے ہاتھ پیر غایب ہو گئے۔ تم نے بھی فرانس اور دوسرے ملکوں میں ان جنگ کے مارے آدمیوں کو دیکھا ہو گا۔ پیرس کی زمین دوز ریل گاڑیوں میں، جسے میٹرو کہتے ہیں، اُن کے لیے جگھیں مخصوص ہوتی ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح سے لوگوں کا ایک دوسرے کو قتل کرنا کوئی اچھی بات تھی؟ سڑک پر دو آدمی لڑتے ہیں تو پولیس کا سپاہی انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور لوگ انھیں احمق سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ احمقانہ کام بڑے بڑے ملکوں کا آپس میں لڑنا اور ہزارہا بلکہ لکھوکھا آدمیوں کو مار ڈالنا ہے۔ یہ تو بس جنگل میں دو وحشیوں کی لڑائی ہوئی۔ اگر انھیں وحشی کہا جا سکتا ہے تو اُن کی طرح آپس میں لڑنے والے ملکوں کو کہیں زیادہ وحشی کہا جائے گا۔

لڑائی کے مسئلے کو اسی روشنی میں تم دیکھو، تو

معلوم ہوگا کہ جنگ عظیم میں حصہ لینے والے اور کشت و خون کرنے والے ملک ـــــ انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی اور دوسرے بہت سے دیس، قطعاً مہذب نہیں ہیں، تاہم تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان ملکوں میں بھی کچھ خوبیاں ہیں اور وہاں کے رہنے والے کچھ لوگ بھی اچھے ہیں۔

یہ سب باتیں سن کر تم کہو گی کہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تہذیب کسے کہتے ہیں، اور تمھارا یہ کہنا صحیح بھی ہوگا۔ یہ بڑا ہی ٹیڑھا سوال ہے۔ اچھی عمارتیں، اچھی تصویریں اور اچھی کتابیں، اور ہر وہ چیز جو حسین معلوم ہو، یقیناً تہذیب کی علامت ہے۔ لیکن ان سب سے کہیں بڑھ کر تہذیب کا اچھا نشان تو وہ آدمی ہوتا ہے، جو بے لوث ہو، اور دوسروں کے ساتھ مل کر سب کی بھلائی کے کام کرتا ہو۔ سب کے ساتھ مل کر کام کرنا، تنہا کام کرنے سے بہتر ہوتا ہے، اور سب کی بھلائی کے لیے مل جل کرنا سب سے اچھا ہے۔

*

قبیلوں کا بننا!

میں نے اپنے پچھلے خطوں میں تمھیں بتایا ہے کہ پہلے پہل آدمی جب وجود میں آیا تو وہ جانوروں سے کتنا مشابہ تھا۔ ہزاروں سال میں، رفتہ رفتہ، اس نے ترقی کی، اور کچھ بہتر بنایا۔ آج بھی جنگلی جانور شکار کرتے ہیں، اسی طرح شروع میں اپنے کھانے کے لیے ہر آدمی بھی تنہا شکار کرتا ہوگا۔ پھر اُسے احساس ہوا ہوگا کہ اور آدمیوں کے ساتھ مل کر اور جھنڈ بناکر گھومنا پھرنا خطرے سے خالی اور دانش مندانہ بات ہے۔ بہت سے آدمی مل کر ایک جھنڈ اگر بنالیں، تو وہ زیادہ طاقت ور ہوجائیں گے، اور جنگلی درندوں، اور دوسرے آدمیوں کے بھی، حملوں کا اچھی طرح مقابلہ کرسکیں گے۔ جانور بھی تو اپنی حفاظت کے خیال سے ریوڑ بناکر چلتے ہیں۔ بھیڑ، بکری اور ہرن، بلکہ ہاتھی بھی، ریوڑ ہی بناکر نکلتے ہیں۔ یہ ریوڑ جب سوتا ہے، تو

اس میں سے کچھ جانور جاگ کر پہرہ دیتے ہیں۔ بھیڑیوں کے ریوڑ کے تو قصے بھی تم نے پڑھے ہوں گے۔ روس میں بھیڑیئے، جاڑوں میں، ریوڑ بنا کر چلتے ہیں، اور جب وہ بھوکے ہوتے ہیں، اور جاڑوں میں تو وہ اکثر بھوکے رہتے ہی ہیں، تو انسانوں پر بھی حملے کر دیتے ہیں۔ ایک بھیڑیا اگر ہوا، تو وہ شاذ ہی آدمی پر حملہ کرے گا، لیکن اگر ریوڑ میں ہوئے تو اپنے کو وہ اتنا طاقت ور سمجھتے ہیں کہ آدمیوں کے جھنڈ پر بھی حملہ کرتے ہوئے نہیں ڈرتے، اور آدمیوں کو اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگنا پڑتا ہے، کبھی کبھی تو بھیڑیوں اور برف پر پھسلنے والی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں دوڑ کا مقابلہ سا ہو جاتا ہے۔

ہاں تو ابتدائی دور کے آدمیوں میں جب تہذیب آنے لگی، تو سب سے پہلے انھوں نے مل کر اپنے جھنڈ بنائے، جسے قبیلہ کہتے ہیں۔ انھوں نے مل جل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ اسی کو مل جل کر کام کرنا کہتے ہیں۔ ہر شخص پہلے پورے قبیلے کی، پھر اپنی بھلائی سوچتا تھا۔ قبیلے کو اگر کوئی خطرہ ہوتا تھا تو قبیلے کے ہر فرد کو اس کا مقابلہ اور بچاؤ کرنا پڑتا تھا۔ کوئی